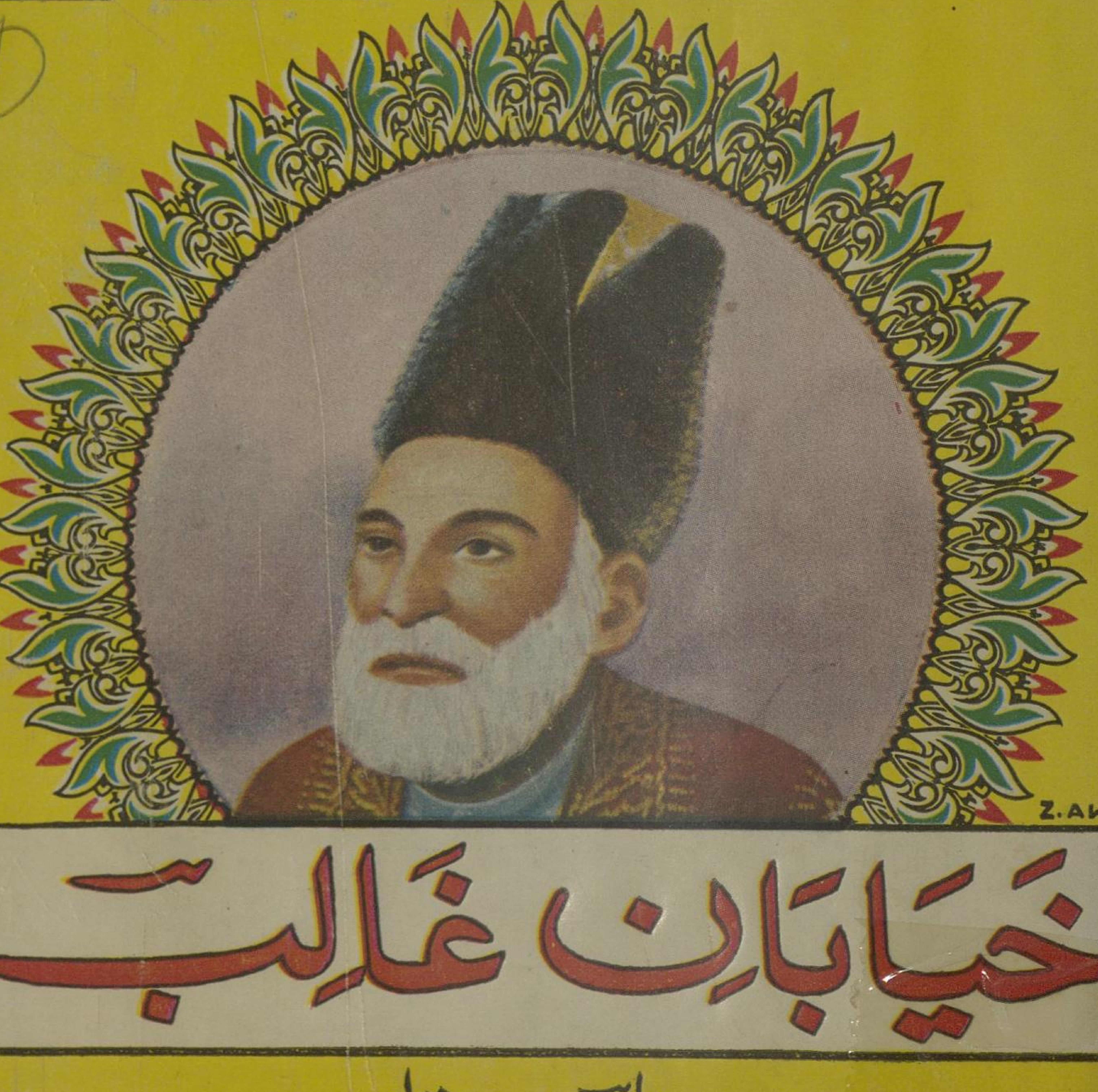




خیابانِ غالب

مؤلف :- نادم سیتاپوری

مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

خیابانِ غالب

نادم سیتاپوری

ناشر
مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

پہلا ایڈیشن ———— اپریل ۱۹۷۰ء

ناشر ———— مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی

مطبع ———— مشہور آفسٹ لیتھو پریس کراچی

قیمت ———— [redacted]



اس پہ گزرے نہ گماں رِیو و ریا کا زنہار   غالب بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے

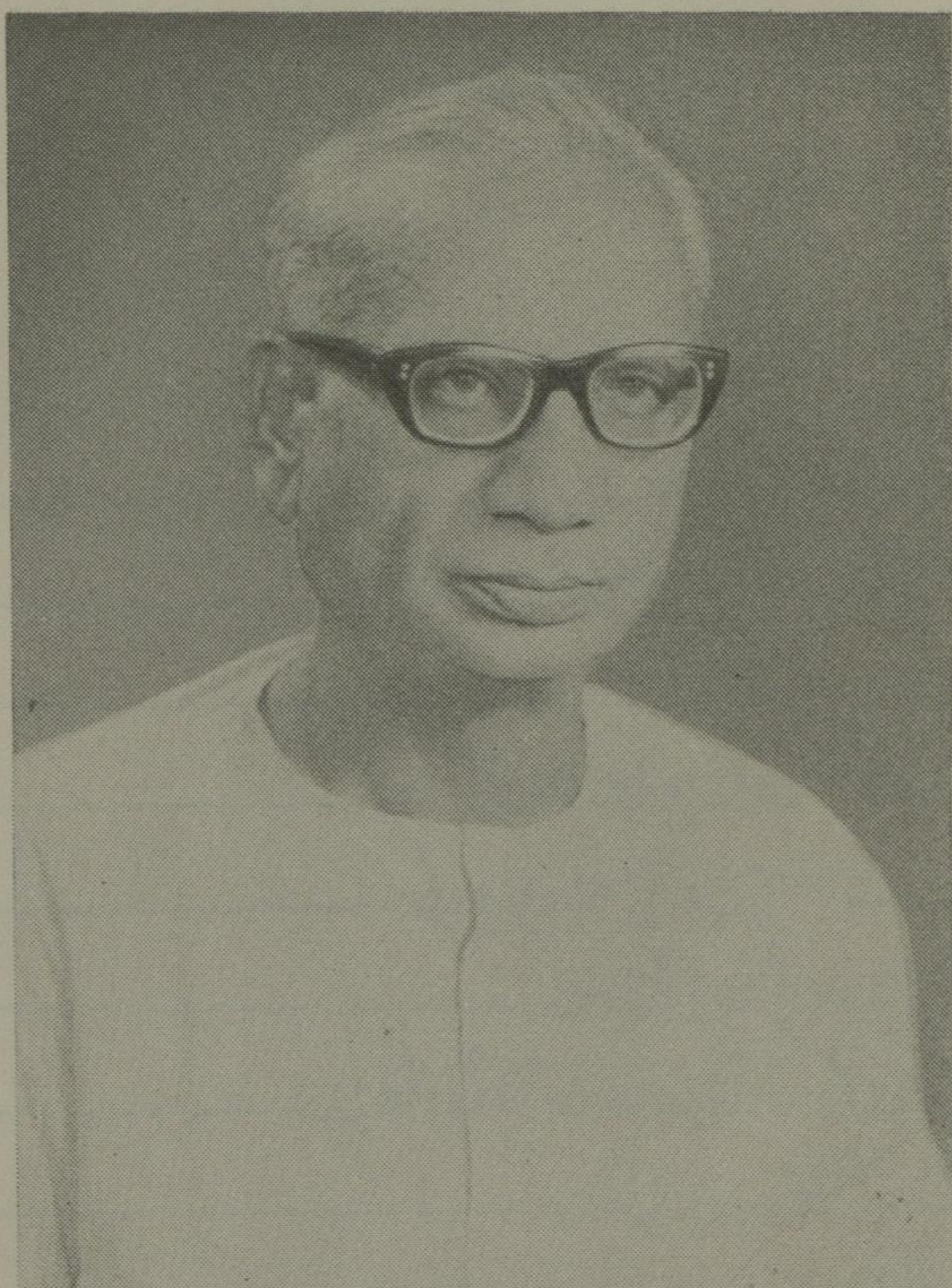
غالبِ خاک نشین اہلِ خرابات سے ہے   ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچّھا کہیں جسے؟

یہ مسائلِ تصوّف۔ یہ ترا بیان غالبؔ

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

عبدالعزیز خالد کے نام

نادم سیتاپوری



نادم سیتاپوری

فہرست مضامین

مطالعات

۱- نسخۂ حمیدیہ ۱۹۲۱ء ایڈیشن - (طبع اوّل)

۲- تاریخ الکہ بھوپال مطبوعہ مطبع عالی جاہ لشکر گوالیار - ۱۳۱۳ھ

۳- دیوانِ غالب مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۵ء

۴- دیوانِ غالب طاہر ایڈیشن ۱۹۳۶ء

۵- باقیاتِ غالب مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ ۱۹۶۰ء

۶- ادبی خطوطِ غالب - ایجوکیشنل پریس کراچی ۱۹۶۴ء

۷- احوالِ غالب - مطبوعات انجمن ترقی اُردو علی گڈھ

۸- آبِ حیات ساتواں ایڈیشن ۱۹۱۳ء

۹- چراغ دہلی مطبوعہ کرزن پریس دہلی

۱۰- کارنامہ سروری مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

۱۱- حلِ کلیات اُردو غالب دہلوی - شوکت المطابع میرٹھ - ۱۸۹۹ء

۱۲- چراغِ سخن (رسالہ عروض و قوافی) مطبوعہ نولکشور لکھنؤ ۱۹۲۱ء

۱۳- لطائف الشعراء مطبوعہ فاروقی پریس دہلی

۱۴- دیوانِ غالب (نسخہ عرشی)

۱۵- دیوانِ غالب (نسخہ مالک رام) شائع کردہ آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۷ء

۱۶- تذکرۂ آبِ بقا - مطبوعہ نولکشور ۱۹۱۸ء

۱۷- مکمل شرح دیوان غالب - مطبوعہ مطبع اشاعت العلوم لکھنؤ

۱۸- ذکر غالب (چوتھا ایڈیشن) مطبوعات مکتبہ جامعہ نئی دہلی

۱۹۔ تلامذۂ غالبؔ ۔ دارالتصنیف وتالیف نکودر
۲۰۔ من کیستم ۔ نامی پریس لکھنؤ۔ ۱۹۴۳ء
۲۱۔ حیاتِ ذوقؔ ۔ مطبع خادم التعلیم لاہور
۲۲۔ غالبؔ کے کلام میں الحاقی عناصر۔ (پہلا ایڈیشن)
۲۳۔ کلیات قدرؔ بلگرامی۔ مطبع مفیدِ عام آگرہ ۱۸۹۱ء
۲۴۔ تاریخ نثر۔ کتاب گھر علی گڈھ
۲۵۔ تذکرہ فرح بخش (نواب یار محمد خاں شوکتؔ بھوپالی)
۲۶۔ تاریخ اخبار رائے سین۔ ہندوستانی پریس لکھنؤ
۲۷۔ تذکرۂ یادگار ضیغم ۔ مطبع قادری حیدر آباد دکن ۱۳۰۳ھ
۲۸۔ دیوان نوحہ جات حیدرؔ (جلد اوّل) نولکشور ۱۸۹۰ء
۲۹۔ غالبؔ (مولانا غلام رسول مہرؔ) چوتھا ایڈیشن
۳۰۔ غالبؔ نامہ (شیخ محمد اکرام) مرکنٹائل پریس لاہور
۳۱۔ اصلاحاتِ غالب (نظم طباطبائی) مطبوعہ اعجاز پرنٹنگ پریس حیدر آباد دکن
۳۲۔ اودھ اخبار لکھنؤ (جلد چہارم) ۱۳؍اپریل ۱۹۶۲ء
۳۳۔ اودھ پنچ لکھنؤ۔ ۱۹؍اگست ۱۹۲۵ء
۳۴۔ ماہنامہ خیابان لکھنؤ۔ نومبر ۱۹۳۳ء جلد ۲ شمارہ ۲
۳۵۔ ماہنامہ شبابِ اُردو لاہور۔ جون ۱۹۲۰ء جلد ۱ شمارہ ۳
۳۶۔ روزنامہ ندیم بھوپال ۔ ۵؍فروری ۱۹۵۶ء
۳۷۔ روزنامہ ندیم بھوپال ۔ ۱۹؍فروری ۱۹۵۶ء
۳۸۔ روزنامہ ندیم بھوپال ۔ ۲۲؍اپریل ۱۹۵۶ء
۳۹۔ اُردوئے معلیٰ دہلی غالبؔ نمبر فروری ۱۹۶۰ء (جلد ۱ شمارہ ۱)
۴۰۔ سہ ماہی فکر ونظر علی گڈھ۔ جنوری ۱۹۶۱ء
۴۱۔ ماہنامہ نیا دور لکھنؤ (جمہوریت نمبر) ۱۹۵۸ء

۴۲۔ نوائے ادب بمبئی بابتہ اپریل ۱۹۵۸ء

۴۳۔ نقوش لاہور غالب نمبر ۱۹۶۹ء

۴۴۔ رندِ پارسا (رئیس احمد جعفری) مطبوعات انجمن ترقی اُردو (ہند) ۱۹۴۵ء

۴۵۔ نثرِ ریاض خیرآبادی مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن ۱۹۴۵ء

۴۶۔ "امیتانامہ" مطبوعہ اشرف پریس لاہور

۴۷۔ تذکرۂ خمخانۂ جاوید۔ لالہ سری رام (جلد پنجم)

۴۸۔ دیوانِ غالب۔ مطبوعات مدینہ پبلشنگ کمپنی۔ کراچی

۴۹۔ غالب نام آورم (نادم سیتاپوری) پہلا ایڈیشن

۵۰۔ ماہانہ۔ افکار کراچی۔ غالب نمبر۔ فروری مارچ ۱۹۶۶ء

۵۱۔ ماہانہ۔ افکار کراچی۔ غالب نمبر۔ فروری مارچ ۱۹۶۹ء

۵۲۔ سہ ماہی اُردو کراچی۔ غالب نمبر شمارہ ۱ جلد ۴۵

۵۳۔ سہ ماہی اُردو کراچی۔ غالب نمبر شمارہ ۲ جلد ۴۵

۵۴۔ کلیات فرقانی۔ مطبوعہ نامی کانپور ۱۹۰۶ء

۵۵۔ سرگزشتِ غالب۔ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد دکن

۵۶۔ ماہنامہ ماہِ نو کراچی (شمارۂ خصوصی) مارچ ۱۹۶۶ء

۵۷۔ ماہنامہ ادبی دنیا لاہور مارچ ۱۹۶۷ء

۵۸۔ کلیاتِ نثرِ حالی۔ مجلس ترقی ادب لاہور۔

برسبیلِ تذکرہ

خیابانِ غالب ــــــ!

غالب پر میری یہ تیسری کتاب ہے !

" غالب نام آورم " تحقیقی مضامین کا ایک مجموعہ کئی سال ہوئے شائع ہو چکا۔ اور مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی کے تعاون و اشتراک سے میری دوسری کتاب ــــ " غالب کے کلام میں الحاقی عناصر " کا دوسرا ایڈیشن بھی چھپ چکا ہے ــــ اب یہ تیسری کتاب بھی محبی جناب حکیم محمد تقی صاحب دہلوی (مالک مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی) شائع کر رہے ہیں جو بہر نوع سلسلۂ " غالبیات " کی ایک ایسی کڑی ضرور ہے جسے سامنے رکھ کر غالب کے مطالعہ کار اس موضوع کے کچھ نئے گوشوں سے روشناس ہو سکیں گے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں تحقیق اور ریسرچ کبھی بھی " حرف آخر " کی معراج حاصل نہیں کر سکی۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ وہ تحقیق ہی نہیں ہے جو تکمیل کے مدارج تک پہنچ جائے ؟ جوں جوں زمانہ بدلتا ہے " زاویۂ نگاہ " کی قدریں بھی بدلتی جاتی ہیں۔ ماضی کے فاصلے کبھی آگے بڑھ جاتے ہیں کبھی قریب بھی آجاتے ہیں۔ حالات کے تقاضے بہت سے ایسے پردے بھی اٹھا دیتے ہیں جو جدید تحقیق کو نئی منزل اور نئی راہوں تک پہنچا دیتے ہیں۔ اور اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس " نقش قدم " سے ہٹ کر ہم تحقیق کی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں

جہاں پرانے زاویۂ نگاہ "تبرکات" سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ کسے معلوم تھا کہ غالب کی وفات کے پورے سو سال کے بعد یہی بھوپال میں "دیوانِ غالب" کا ایک ایسا نادر مخطوطہ بھی دستیاب ہو جائیگا جسے خود غالب نے اپنے قلم سے لکھا ہے اور "نسخۂ حمیدیہ" سے پہلے ضبط تحریر میں لایا گیا ہے۔

میرے ان مضامین میں کچھ نئے موضوع بھی شامل ہیں۔ ایسے سبجکٹ! جن پر یا تو کچھ لکھا ہی نہیں گیا۔؟ اور اگر لکھا گیا تو اتنا کم۔ جس سے تحقیق کی تشنگی دور نہیں ہو سکتی۔ مَیں نے کوشش کی ہے ان عنوانات میں کسی نہ کسی نہج سے کچھ گوشے ایسے ضرور آجائیں جو پڑھنے والوں کو تصویر کے اس دوسرے رُخ کیطرف بھی متوجہ کر دیں جو عام طور سے سامنے نہیں ہے؟

اپنے اس مقصد میں کس حد تک مَیں کامیاب ہوا؟ اسکے بارے میں کسی پیش قیاسی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ یہ فیصلہ ان مطالعہ کاروں کا حق ہے جو غالبیات سے وابستہ ہیں۔۔۔۔ ! لیکن اس اعتراف میں بھی مجھے قطعاً پس و پیش نہیں ہے کہ ان عنوانات کے تحت میری کدوکاوش بہرحال "حرفِ آخر" نہیں ہے۔

غالب کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں "غالبیات" پر اتنا کام کیا گیا ہے جسے اگر یکجا کر دیا جائے تو ایک عظیم ادبی کتب خانے کی بنیاد رکھی جا سکتی ہے۔ اس کام کی نوعیت تحقیقی بھی ہے اور تنقیدی بھی۔! تعمیری کام بھی ہوا ہے اور تخریبی بھی۔! ٹھوس اور کامیاب نقطۂ نظر کے نقوش بھی سامنے آئے ہیں اور "زاویۂ نگاہ" کی بدلی ہوئی شکلیں بھی! نئے موضوعات کی تلاش میں بعض ارباب قلم اپنی منزل کو پیچھے چھوڑ گئے۔ کچھ بہت آگے نکل گئے! لیکن اسکے باوجود تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس سو سال کے اندر غالب پر جتنا اچھا کام ادھر چند سال کے اندر کیا گیا ہے اسکی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی؟

"غالبیات" پر ادھر جو تحقیقی کام ہوا ہے اس نے ہمیں یہ سوچنے پر بھی مجبور کر دیا ہے کہ اس صدی کی تقریبات نے تحقیق جدید کو "سود و زیاں" کے جس دوراہے پر لاکر کھڑا کر دیا ہے؟ کیا اسکا "تجزیہ" ہم آنیوالی نسلوں کے لئے چھوڑ جائیں۔ یا ہم خود سنجیدگی

کے ساتھ اپنے کام کا محاسبہ کر کے اس کا اعتراف کرلیں کہ ہم نے "غالبیات" میں جتنے زیادہ اضافے کئے ہیں اس سے کچھ زیادہ نقصان تحقیق کے بنیادی اصولوں کو بھی پہنچایا ہے ؟

"غالبیات" کے سلسلے میں غیر صحت مند زاویۂ نگاہ کے جو جراثیم ہماری تحقیق میں سرائت کر گئے ہیں انکا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہو جائے گا کہ زاویۂ نگاہ کی یہ غیر متوازن تبدیلی کسی "نئے پن" کی خواہش ہی نہیں ہے بلکہ بے راہ روی کی ایک ایسی اُپج بھی ہے جسکا تعلق نہ تو تنقید سے ہے نہ تحقیق سے ۔؟

ہماری روائتی تہذیب و متانت کے باوجود تحقیق کا نہ کوئی مسلک ہے نہ مذہب؟ اظہار عقیدت اور غلوئے محبت کا تو ذکر ہی کیا؟ تحقیق کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہم کسی خاص مشرب و مسلک کے حلقہ بگوش رہکر ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا نہیں ہوسکتے جو تحقیق کی جان ہیں ۔ اسی لئے جب ہم دیکھتے ہیں کہ "تحقیق" کو اظہارِ عقیدت کا آلۂ کار بنا لیا گیا ہے تو ہم یہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ خطرناک رجحانات کسی وقت بھی ہماری تحقیق کو "مقصدی ادب" کی طرف لے جا سکتے ہیں ۔

غالبیات کے سلسلے میں "غالبؔ اور ابوالکلام آزادؔ" قسم کے اضافے ! اسی "زاویۂ نگاہ" کی پیداوار ہیں جسکا آغاز ہمارے بزرگ کر چکے ہیں ۔؟ سوال یہاں پر مولانا آزاد کی علمی و ادبی شخصیت کا نہیں ہے بلکہ تحقیق کی جن ذمہ داریوں کا بار ہم مولانا آزادؔ پر ڈالنا چاہتے ہیں اس کے بارے میں "فرطِ عقیدت" سے ہٹ کر ہمیں سنجیدگی کیساتھ یہ تجزیہ بھی کرنا پڑے گا کہ کیا مولانا آزادؔ کی ذاتِ گرامی اسکی متحمل بھی ہو سکتی ہے ؟ ہر مستند عالم نقاد و محقق نہیں ہوتا ۔ تحقیق کے لئے حاسۂ انتقاد ضروری ہے لیکن نقد نگار کیلئے محقق ہونا ضروری نہیں ۔ بالکل اسی طرح ہم دلی احترام و عقیدت کے باوجود مولانا آزادؔ کو حالیؔ کی طرح "غالبیات" کی ایک اہم کڑی نہیں قرار دے سکتے !یہ صحیح ہے کہ اس صدی کے ممتاز غالبؔ پسندوں میں مولانا آزادؔ مرحوم بھی اپنا ایک مقام رکھتے ہیں ۔ لیکن خود ان کے بیانات میں روایات کا جو تضاد پایا گیا ہے اس نے ان کی

شخصیت کو متنازعہ بنا دیا ہے۔ میرے دل میں مولانا آزاد مرحوم کیلئے ایک مخلصانہ احترام ہے! مَیں انکو ایک صاحبِ طرز انشار پرداز اور فارسی ادبیات کا عالم بھی تسلیم کرتا ہوں لیکن انکی نقل کردہ روایات کو اپنے لئے ذریعہ استدلال بنانا مناسب نہیں سمجھتا۔! مولانا آزاد ہی کے وقت میں غالب کے کتنے عقیدت مند موجود تھے جنھیں ہم غالبیات کا موضوع بنا سکتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ علاّمہ نظم طباطبائی۔ نواب حامد علی خاں بار ایٹ لا (لکھنؤ) ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری (وغیرہ) کا دامن اس شخصی پروپیگنڈے سے خالی تھا جس میں غالب سے عقیدت اور محبت کے پھول مہکا کرتے تھے۔

موضوعات کی "تنگ دامانی" نے ایک طرف تو اس قسم کے عقیدت مندانہ رجحانات کو ہوا دی دوسری طرف ہر بات کے ثبوت میں غالب کے بیانات اور تحریروں کی تلاش شروع ہوگئی! اگر یہ جستجو صرف تحقیق کے بنیادی اصولوں تک محدود رہتی تو بھی غنیمت تھا لیکن اس "جستجو اور تلاش" کا مقصد صرف قدیم تذکرہ نگاروں کی "تردید و تکذیب" قرار دے لیا گیا۔ مولانا حالی تو یہ لکھنے کے بعد بھی ناقدین اور محققین کی نگاہِ "بد" سے محفوظ ہیں۔

> "تم نے بعضے مصنفوں کو دیکھا ہو گا کہ وہ حد سے زیادہ بدیہی اور مسلم الثبوت دعوے پر بھی جب کسی کا قول سنداً نقل کرتے ہیں تو اس مصنف کا نام۔ کتاب کا نام۔ باب اور فصل کا پتا صفحہ اور سطر کا شمار۔ سنہ طباعت۔ مطبع کا نام اور سوائے اس کے اور بھی پتے مفصل لکھتے ہیں حالانکہ ان دعوؤں کو تسلیم کرنے میں جنکی تائید میں وہ یہ مفصل سندیں لکھتے ہیں کسی کو بھی کلام نہیں ہوتا۔ مگر ان کو اپنی بے اعتباری کا ایسا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اگر ان کی کتاب ضروری مقدار سے دس گنی زیادہ ہو جائے تو بھی وہ اس تفصیل سے

باز نہیں آسکتے۔"

(صفحہ ۱۳۶۔۱۳۷۔کلیات نثر حالی (جلد اول)

شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۷ء)

مگر صاحب "آب حیات" آج بھی نشانۂ ملامت بنے ہوئے ہیں۔ اس جرم میں۔ کہ جس روایت کو حالی نے بھی روایت بالمعنیٰ کے طور پر نقل کیا ہے "انتخاب دیوانِ اردو" کی وہ روایت مولانا آزاد نے "آبِ حیات" میں کیوں تحریر فرمائی! لیکن "آبِ حیات" کی تنقید و تردید میں جس لب و لہجے اور غیر منطقی استدلال سے کام لیا جاتا ہے "یادگارِ غالب" میں اسی روایت کو پڑھنے کے بعد وہ جوش و خروش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔

حالی کا مندرجہ بالا "نظریۂ تحقیق" آج کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتا ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ "جدید تحقیق" کے بنیادی اصول اس سے ہم آہنگ بھی نہیں ہو سکتے۔ خود "کلیاتِ نثر حالی" کے مرتب مولانا محمد اسمٰعیل پانی پتی نے حالی کے اس نظریے سے اختلاف کیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں :۔

مولانا حالی کا یہ فقرہ سمجھ میں نہیں آیا (کہ) "جب ہم کسی مضمون میں کسی شخص کا کوئی مقولہ درج کرتے ہیں تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اسکا پورا حوالہ وہاں نقل کر دیں۔!" تمام دنیا کے مصنف اور مؤلف یہی کرتے ہیں اور اسی کو دیانت اور امانت سمجھتے ہیں۔ بغیر حوالے کے کوئی بات خواہ وہ کتنا بڑا آدمی کہے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ مقولے کے علاوہ بھی تاریخی اور علمی کتابوں میں حوالے دینے ضروری ہوتے ہیں تاکہ جو شخص اس مضمون پر مزید تحقیق کرنی چاہئے اسے آسانی ہو۔ خود مولانا (حالی) نے اپنے تمام مضمونوں میں دوسرے لوگوں کے مقولے بکثرت

بیان کئے ہیں دوسری کتابوں کے اقتباسات اپنے
دعوے کے ثبوت میں پیش کئے ہیں اور ہر جگہ مصنف
اور اسکی کتاب کا حوالہ درج کیا ہے۔"
(فٹ نوٹ صفحہ ۱۳۷۔ کلیات نثر حالی)

جہاں تک میں سمجھتا ہوں حالی کا یہ نظریہ تحقیق اس "خوردہ گیری" کا ردِ عمل تھا جسکا آغاز اس عہد میں ہو چکا تھا۔ کتابوں کے تفصیلی حوالے اور سند و اسناد کی مکمل تفصیلات اس زمانے میں ٹھوس علمی اور مذہبی کتابوں تک محدود تھیں۔ ادبی کتابوں اور قدیم شعراء کے تذکروں میں اس قسم کی تصریحات شائد ہی کہیں نظر آئیں؟ شبلی کے "موازنہ انیس و دبیر" کا مرکزِ خیال عبدالغفور نساخ کی "انتخاب نقص" ہے جسمیں پہلی بار انھوں نے "انیس و دبیر" پر اعتراضات کئے ہیں۔ اس سلسلے میں گذشتہ صدی کے آخر میں ایک عظیم ادبی انتشار پھیلا رہا۔ مگر شبلی نے "موازنۂ انیس و دبیر" میں کہیں اسکی چھاؤں بھی نہ آنے دی کہ موازنے کا مرکزِ خیال دراصل نساخ تھے۔

حالی نے جو کچھ لکھا ہے وہ یقیناً "تحقیق جدید" کیلئے قابل قبول نہیں ہے لیکن حالی کے ان الفاظ میں اس عہد کا ذہن ضرور موجود ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس دور میں علمی خود اعتمادی "انانیت" کی حد سے تجاوز کر چکی تھی۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ ہمیں اس عہد کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا جب آج کی طرح "انٹرویو" حاصل کرنے کا رواج نہیں تھا۔ میر مصحفی میرزا علی لطف۔ بینی نرائن جہاں وغیرہ نے اپنے تذکروں میں جن متقدمین یا معاصرین کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے اسکے دو ہی ذریعے ہو سکتے تھے یا تو ان حضرات نے اسی عہد کے لوگوں سے معلومات فراہم کی ہونگی یا اپنے معاصرین کے بارے میں اپنی ذاتی معلومات پر انحصار کیا؟ ایک ہی معاصر شخصیت کے بارے میں دو ہم عصر تذکرہ نویسوں میں تضاد کا بھی امکان ہے! لیکن ان کا جائزہ لیتے وقت اگر ہم "خوردہ گیری" کا شکار ہو گئے تو تحقیق کا دامن تنگ ہو جائے گا۔

روایات کو تحقیق میں جو اہمیت حاصل ہے اس سے انحراف اسی طرح ناممکن ہے

جس طرح روایات کو "درایت اور رجال" کی کسوٹی پر پرکھتے وقت عہد و ماحول کو نظر انداز کر دیا جائے ـــــ ! غالبؔ جس عہد کی شخصیت تھا اس عہد کے کس شاعر یا ادیب کے خطوط اتنی بڑی تعداد میں فراہم کئے جا سکے ؟ اور جو کچھ دستیاب ہو گئے ہیں انھیں دیکھتے ہوئے کون یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ انکے علاوہ غالبؔ نے کسی اور کو خطوط لکھے ہی نہیں ـ ؟ یا آیندہ انکی کسی تحریر کے دستیاب ہونے کا کوئی امکان ہی نہیں ـ ؟

"غالبؔ صدی" کے سلسلے میں جو کام کیا گیا "موضوع" کی کمیابی کی وجہ سے بعض محققین کو صرف "نسخۂ حمیدیہ" ہی پر قناعت کرنا پڑی ـ چنانچہ اس سلسلے میں "بے مقصد" مضامین کا ایک طویل سلسلہ شروع کیا گیا ہے جسمیں گھما پھرا کر صرف ایک ہی بات کہی جارہی ہے کہ "نسخۂ حمیدیہ" سے میاں فوجدار محمد خاں کا کوئی تعلق نہ تھا ـ

اصل "نسخۂ حمیدیہ" گم ہو چکا ہے اسی بھوپال نے خود غالبؔ کے ہاتھ کا لکھا ہوا اس سے پہلے کا ایک اور مخطوطہ بھی مہیا کر دیا ـ لیکن "نسخۂ حمیدیہ" کے متعلق ایک لاحاصل امکانی اور قیاسی بحث کا سلسلہ ہنوز جاری ہے جسمیں کہیں تو میاں فوجدار محمد خاں کی ان مہروں سے تردید کی جاتی ہیں جو اصل نسخے پر ثبت تھیں ـ اور کہیں میاں فوجدار محمد خاں کے صاحبزادے میاں یار محمد خاں شوکتؔ بھوپالی (تلمیذ غالبؔ) سے غالبؔ کے خطوط کا مطالبہ کیا جاتا ہے ـــ اور "انشائے نورِ چشم" (مؤلفہ شوکتؔ بھوپالی) میں مرزا محمد عباسؔ رفعت شروانی کے نام خطوطِ غالبؔ کی عدم اشاعت کو ایک بے مقصد بحث کا ماحصل قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے ـ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ رفعتؔ شروانی اور شوکت بھوپالی کے نام غالبؔ کے کافی خطوط تھے ـ ! ہو سکتا ہے جس طرح غالبؔ کا خود نوشت دیوان تخمیناً ڈیڑھ سو سال کے بعد دستیاب ہو گیا ـ اس قسم کے خطوط بھی کہیں مل جائیں ـ

اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت کے سلسلے میں جناب حکیم محمد تقی دہلوی کا کرم خاص شامل رہا ـ اور برادرم حضرت صہباؔ لکھنوی مدیر افکار کراچی کا ممنون و متشکر ہوں جنکے

مشوروں نے ہر قدم پر مجھ سے تعاون کیا۔! ناسپاس گذاری ہوگئی اگر جناب احمد طاہر کا شکریہ ادا نہ کیا جائے جنھوں نے کافی عرق ریزی کے ساتھ اس کتاب کی "پروف ریڈنگ" کی ہے۔

شاہ حوری

ناظم :

۲۸ر اکتوبر ۱۹۶۹ء کراچی

۱۷

غالب اور سیاست

ذوالفقار

غالبؔ اور سیاست

"یہ مقالہ ۱۶ر فروری ۱۹۶۵ء کو "شامِ غالبؔ" منعقدہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ میں پڑھا گیا تھا اب حذف و اضافے کے بعد پیش کیا جا رہا ہے۔"

غالبؔ سیاست داں تو نہیں تھے مگر اس دور کی سیاست جس انقلابی محور کے گردش کناں تھی اس سے بے خبر بھی نہیں کہے جا سکتے!

(۱)

درانی، ابدالی، اور اور پٹھانوں کی خون آشامیوں کی ہلکی ہلکی چھینٹیں ابھی تک دلی کے گلی کوچوں پر کہیں کہیں چمکتی ہوئی نظر آتی تھیں اور ان "اوراق مصوّر" پر ابھی تک ارتعاش سا چھایا ہوا تھا۔ چنانچہ اس سبک خرام تموّج نے دامن دل کو اتنا متاثر کیا کہ وہ اپنے پیشۂ آبا، "سپہگری" کو ایک طویل عرصے تک بھولے رہے اس کی یاد آئی بھی تو اس وقت! جب درباری سیاست کے ایک ہلکے سے جھونکے نے ساری دلی میں ذوق کے سہرے کو زبان زد خاص و عام کر دیا۔ غالبؔ کو پہلی بار یہ محسوس ہوا کہ وہ سچ مچ درباری سیاست کے منہ میں پہنچ چکے ہیں گھبرا اُٹھے۔ "گذارش احوال واقعی" لکھ کر اپنی پوزیشن صاف کی اور یہاں تک کہا؛

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے،

اوّل تو اس دور کی سیاست اپنے مفہوم و مقاصد کے اعتبار سے آج کی سیاست تھی نہیں۔ دوسرے غالبؔ کی زندگی کا آغاز ہی کچھ ایسے خاندانی اور گھریلو جھگڑوں سے ہوا

کہ اگر وہ اس شخصی دَورِ حکمرانی کے سیاسی مدوجزر کے قریب ہونا بھی چاہتے تو ممکن نہ تھا جاگیر کا جھگڑا۔ پنشن کا مقدمہ لوہارو کی جائداد کا قضیہ۔ اور سب سے زیادہ ادبی معرکہ آرائیاں! فتح بنگالہ وسرنگاپٹم کے بعد انگریزی سامراج کی سازشیں "معاہدۂ لیک" کی سازشیں (۱۸۰۶ء) کی شکل میں شہنشاہ ہند کو لال قلعہ میں محصور کرکے "اہل سیف" کو بہت حد تک بے دست و پا کرچکی تھیں اور ان میں سے بہتیرے صرف "صاحبِ قلم" ہی تک محدود ہو کر رہ گئے تھے! غالبؔ کی زندگی پر بھی اسی اُتار چڑھاؤ کا سایہ پڑا اور ان کے کردار میں کِسی قسم کا مجاہدانہ عزم و ولولہ پیدا نہ ہوسکا یہاں تک کہ غدر ۱۸۵۷ء میں وہ "ہیچ آفت نہ رسد......!" کہکر خانہ نشین ہوگئے۔ لیکن آدمی تھے "ہوش گوش" کے در پردہ قلعہ[۱] سے بھی ربط و ضبط قائم رکھا کہ اگر کہیں پانسہ پلٹ گیا اور بدیسی سامراج اپنے قدم نہ جما سکا تو قلعہ کا توسل اور تعلق تو بہرحال امید افزا ثابت ہی ہوگا۔!

غالب کی سوجھ بوجھ اور جہاں دیدگی کی ایسی ہی مثالیں اور بھی ہیں۔ جناب مالک رام نے لکھا ہے۔

> " پیر کے دن ۵ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت چند گورے کوچہ بندی کی دیوار پھاند کر محلے میں گھس آئے۔ مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انھیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی گوروں نے لوگوں کے مال و اسباب کو تو ہاتھ نہ لگایا لیکن مرزا (غالبؔ) اور ان کے ہمسایوں میں سے چند آدمیوں کو پکڑے گئے اور کرنل برن کے سامنے پیش کر دیا۔ دراصل تفتیش ہو رہی تھی کہ شہر میں کون کون سے محلے میں مسلمان مقیم ہیں۔ کرنل برن نے ان لوگوں سے نام اور مقام اور پیشے وغیرہ کی کیفیت پوچھی جب مرزا غالبؔ کی باری آئی تو اس نے ان کی کلاہ پاپاخ اور ایرانی وضع پر متعجب ہو کر ان سے پوچھا۔

---

[۱] صفحہ ۱۱۹ - ذکرِ غالبؔ چوتھا ایڈیشن

" وَل ٹم مسلمان"۔؟
انھوں نے جواب دیا۔
حضور آدھا۔!
کرنل صاحب حیران! کہ یہ کیا کہتے ہیں۔پوچھنے پر بولے!
قبلہ شراب پیتا ہوں سُؤر نہیں کھاتا۔اس لئے آدھا کہا۔!
سب ہنس پڑے اور ان کے ساتھ دوسروں کو بھی ہنسی خوشی
واپس آنے اور محلے میں بدستور مقیم رہنے کی اجازت ملگئی"۔
(صفحہ ۱۲۱۔۱۲۲۔ ذکر غالب۔چوتھا ایڈیشن)

(۲)

ظاہر ہے کہ ان ذاتی مصلحت بینیوں سے ملکی سیاست اور تدبر کو دُور کا بھی لگاؤ نہیں تھا؟ سیاسی نوعیت کے صرف دو واقعے غالب کی زندگی میں ملتے ہیں۔ایک تو ولیم فریزر کا قتل! دوسرا سکہ کا الزام۔یہ دونوں واقعے ایک حیثیت سے اس دور کی پیچیدہ سیاست سے گہرا تعلق رکھتے تھے لیکن غالب کو ان سے واقعی کوئی تعلق نہ تھا ولیم فریزر کے قتل کی سازش سے نہ اُن کا کوئی واسطہ تھا اور نہ سکہ" کہنے سے!یہ دونول الزام اتنے بے بنیاد اور لغو تھے کہ بہت ہی جلد حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے۔

غدر میں دلی پر جو کچھ بیتنا تھی بیت گئی۔غالب نے اپنی آنکھوں سے آگ وخون کے دریا اُبلتے دیکھے تھے اور اس ہنگامۂ جنگ وجدال سے اتنے سہمے ہوئے تھے کہ اپنے قریبی احباب کا نام لیتے ہوئے ڈرتے تھے ان کے سب سے بڑے دوست اور محسن مولانا فضل حق خیر آبادی جنھیں وہ" فخر ایجاد وتکوین" سمجھتے تھے جس ابتلائے عظیم میں پھنس گئے مرزا یقیناً اس سے بے خبر نہ تھے مگر اس زمانے کے اب تک صرف دو ہی خطوط ایسے دستیاب ہوئے جن میں ان کا ذکر ملتا ہے۔منشی داد خاں سیاح کو تحریر فرمایا۔

" ہاں خانصاحب۔آپ جو کلکتے پہونچے اور صاحبوں سے ملے ہو تو "مولوی فضل حق" کا حال اچھی طرح دریافت کرکے مجھ کو لکھو

اس نے رہائی کیوں نہ پائی اور وہاں جزیرے (انڈمان) میں
اس کا کیا حال ہے۔ کس طرح گزر ہوتا ہے؟

مرزا ڈرتے تھے کہ اگر انگریزوں کے اس باغی (مولانا فضل حق خیر آبادی) کا نام زبان پر آگیا تو میرا شمار بھی کہیں "پانچویں سواروں میں" نہ ہونے لگے۔ لیکن ان کے دل میں مولانا کی جو عزت و عظمت تھی وہ یقیناً اَمٹ تھی چنانچہ اپنے آخری ایام زندگی میں جب ہندوستان کا سیاسی مطلع بہت حد تک صاف ہو چکا تھا شیخ لطیف احمد بلگرامی کو لکھا:-

"کیا لکھوں اور کہوں۔؟ نور آنکھوں سے جاتا رہا اور دل سے سرور۔ ہاتھ میں رعشہ طاری ہے کان سماعت سے عاری ہے ؎

عتاب در عروسان در آمد بجوش
صراحی تہی گشت و ساقی خموش

فخر ایجاد و تکوین مولٰنا فضل حق ایسا دوست مرجائے
غالبؔ نیم مردہ و نیم جان رہ جائے......."

اس تمام پس منظر کی روشنی میں نہ غالب پر سیاست داں ہونے کا اطلاق کیا جا سکتا ہے نہ یہ دعویٰ کہ وہ ملکی تدبر اور بصیرت رکھتے تھے پھر بھی ان کی ایک "نیم سیاسی نثر" ایسی دستیاب ہوئی ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے عہد میں جو سیاسی اتار چڑھاؤ ہوتے رہے، ان سے وہ بے خبر نہیں تھے!

غالبؔ کی یہ نثر جو پوری ایک صدی کے بعد پہلی مرتبہ پیش کی جا رہی ہے اس دور کی "عالمی سیاست" سے تعلق رکھتی ہے اور ایسا ہی "نظریہ" ہے جس سے اس عہد کا کوئی ہندوستانی انحراف نہیں کر سکتا تھا۔ غدر سن ستاون کے بعد ہندوستانی مسلمان انگریزوں کی نگاہوں میں خار کی طرح کھٹکنے لگے تھے اور نئے حکمران ہر وقت ان سے مشکوک اور مشتبہ رہا کرتے تھے۔

انگریزوں کا "پرچم استبداد" راس کماری سے لے کر درۂ خیبر تک لہرا چکا تھا۔

افغانستان میں بھی سازشوں کے تانے بانے پاؤں جمانے کی کوشش کر رہے تھے۔ روس ایران میں قدم جمانے کی منصوبے بنا رہا تھا۔ ہندوستان پر انگریزی تسلط کو پانچ سال گزر چکے تھے لیکن انگریز ابھی تک مطمئن نہیں تھے اور ایسی تمام خبروں سے ہندوستانی مسلمانوں کو بے خبر رکھنا چاہتے تھے جن سے متاثر ہو کر ہندوستان کا امن و امان خطرے میں پڑ سکتا تھا۔ واقعہ کچھ بھی ہو لیکن افواہیں اس زمانے میں کچھ ایسی ہی مشہور ہو گئی تھیں کہ روس کی شہ پر ایران افغانستان پر حملہ کرنا چاہتا ہے اور ہندوستان کی نئی حکومت ان خبروں سے اتنا سراسیمہ تھی کہ اس سلسلے میں اسے روس کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لئے ایک خفیہ مشن بھیجنا پڑا تھا جس میں "صاحب آبِ حیات" مولانا محمد حسین آزاد بھی شامل تھے۔

غالبؔ کی یہ تحریر "اودھ اخبار لکھنؤ" ۱۳ اپریل ۱۸۶۲ء (مطابق ۲۳ شوال ۱۲۷۸ھ) جلد چہارم میں صفحہ ۲۸۱ پر شائع ہوئی تھی "اودھ اخبار" اور نولکشور پریس پر اس زمانے میں غالبؔ کے ایک خاص شاگرد نواب مردان علی خاں رعنا مرادآبادی کا خاص اثر تھا۔ نواب مردان علی خاں رعنا کی بیشتر کتابیں اسی نولکشور پریس کی چھپی ہوئی ہیں اور منشی نولکشور سے ان کے خاص مراسم تھے۔ وہ منشی صاحب سے ملنے لکھنؤ بھی آیا کرتے تھے۔ "اودھ اخبار" کے ابتدائی دور میں اس اخبار کا شاید ہی کوئی شمارہ ایسا ملے جس میں رعنا کی کوئی نظم، نثر یا غزل شامل نہ ہو۔

غالبؔ اور منشی نولکشور کے تعلقات کا آغاز کیسے ہوا؟ اس کے بارے میں کوئی یقینی بات تو نہیں کہی جا سکتی لیکن میرا خیال ہے کہ ان دونوں کے درمیان رعنا ہی ایک ایسی کڑی ہو سکتے ہیں جنھوں نے ان دونوں میں اس حد تک ربط و ضبط پیدا کر دیا کہ مرزا کی زندگی میں ان کی دو کتابیں (قاطع برہان[1] و کلیات فارسی) نولکشور پریس نے شائع کیں

---

[1] قاطع برہان کا جو فارسی اشتہار اودھ اخبار میں شائع ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲ اپریل ۱۸۶۲ء تک "قاطع برہان" طباعت کے مراحل طے کر چکی تھی اور اس کی قیمت ایک روپیہ تھی قاطع برہان کا پہلا اشتہار ۴ دسمبر ۱۸۶۱ء کے اودھ اخبار میں بزبانِ فارسی شائع ہوا تھا۔
(نادم سیتاپوری)

اور اودھ اخبار میں ان کے خطوط۔ مضامین اور غزلیں بھی شائع ہوتی رہیں۔
"اودھ اخبار" کے ابتدائی فائل تقریباً نایاب ہو چکے ہیں۔ منشی نولکشور کے ورثار (راجہ رام کمار اور راجہ تیج کمار) میں جب بکڈپو وغیرہ کی تقسیم ہوئی تو کہا جاتا ہے کہ "اودھ اخبار" کے زیادہ تر فائل تلف ہو چکے تھے جو کچھ بچے تھے وہ ایک "صاحبِ نظر" ہتھیا لائے جو ان کے لئے سانپ کے منھ کی چھچھوندر بنے ہوئے ہیں بیچارے کو نہ نگلتے بنتی ہے نہ اگلتے؟ کبھی کبھی اس کی ایک آدھ تحریر یا غالب کا کوئی خط اس سے نقل کر دیا کرتے ہیں اور بس!
پیشِ نظر فائل (۱۸۶۱ء - ۱۸۶۲ء) مظہر عالم لائبریری (نخاس لکھنؤ) میں محفوظ ہے۔
غالب کا یہ مضمون یا مراسلہ جسے "نثر" کا عنوان دیا گیا ہے انگریزی حکومت کی تعریف و توصیف سے تعلق رکھتا ہے جس میں انھوں نے ہندوستانیوں کو یہ مشورہ دیا ہے کہ وہ ایران و افغانستان کی جنگ کی افواہوں پر یقین کر کے اپنی ذہنی اور دماغی الجھنوں میں اضافہ نہ کریں۔ بلکہ کامل صبر و سکون کے ساتھ انگریزوں کی خوش انتظامی اور تعمیری ترقیوں کے ممنون و سپاس گزار ہوں!

غالب کی اس نثر سے پہلے اور بعد میں اسی قسم کے اور بھی کئی مراسلے اور مضمون دوسرے لوگوں کے بھی شامل ہیں جنھیں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس "پروپیگنڈہ مہم" کے میرِ کارواں بھی نواب مردان علی خاں رعنا تھے اور غالباً غالب نے یہ مراسلہ بھی انھیں کے ایما و اشارے پر لکھا تھا۔ کیوں کہ غالب کی اس "نثر" کے بعد ہی ۱۳ر مئی ۱۸۶۲ء کے "اودھ اخبار" میں رعنا کا ایک طویل مراسلہ (خیال خیر مآل رعنا) غالب کی تائید میں شائع ہوا ہے جو من و عن درج ذیل ہے:-

"بہ تبعیت مضمون خیر اندیشی جناب مرشدنا و اُستاذنا حضرت غالب دام فضلہم بمادہ تنبیہ ابلہان نسبت و شہرت جنگ اہل ایران با افغانستان،

مکرمِ خاکسار۔ صاحب اودھ اخبار سلامت! آپ کے اخبار حق نگار مطبوعہ ۲۳ر اپریل سنِ رواں کے صفحہ ۲۸۱

میں عبارت نثر ریختہ قلم جواہر رقم حضرت اوستادی جناب والا مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی دام افضالہم کی درباب تہدیہ وتنبیہہ عوام کج فہمانِ ہند میری نظر سے گذری جس سے یہ مقصود رہے کہ (افواہ جنگ ایرانیان باافغانان میں خام خیال لوگ کیا کیا خیال خام کرتے ہیں چاہئیے کہ امن و امان کو جو بہ لطف وحمایت سرکار برطانیہ دام ملکہم کے ہر خاص وعام کو خداداد حاصل ہے غنیمت جان کر ایسی افواہ اور ظن فاسد وخیال ناقص سے محترز رہ کر چین سے اوقات بسر کریں)۔

از آنجا کہ تحریر جناب ممدوح کو حق بجانب اور عین خیر اندیشی حاکم ومحکوم ہے اس لئے اُس کو منتج نتائج خیر و عافیت عام جان کر کے اس مطلب مافی الضمیر کو میں بھی حتی الوسع بسط کرنا سعادت جان کر .... عارض ہوں کہ آپ بوسیلۂ اندراج اخبار گوہر بار خود بندگانِ خدا کو اس سے متنبہ اور حکام عہد کو اس طرف متوجہ فرمائیے گا......!"

(مراسلہ بوجہ طوالت حذف کر دیا گیا۔) صفحہ ۲۳۶)

یہ مردان علی خاں رعناؔ (وفات ۱۸۷۹ء) بڑے کٹر قسم کے انگریز پرست تھے ان کی ملازمت کا آغاز ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے ۔ ۱۸۵۰ء میں ہوا۔ چھوٹی جگہ سے ترقی کر کے تحصیلداری کے عہدے تک پہنچے تھے۔ غدر کے بعد انگریزی ملازمت سے استعفیٰ دیدیا اور دیسی ریاستوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے آدمی علم دوست اور صاحبِ تصانیف کثیرہ تھے افسوس کہ ان کے نام غالبؔ کے کوئی خطوط اب تک دستیاب نہیں ہوسکے ورنہ اسکا صحیح اندازہ کیا جا سکتا کہ ان کے اور غالبؔ کے درمیان کتنے گہرے مراسم و تعلقات تھے؟

غالبؔ کا محولہ بالا مضمون یا خط " اودھ اخبار" نے انتخاب اخبارات" کے تحت شائع کیا ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مضمون کسی دوسرے اخبار یا رسالے سے " اودھ اخبار" میں نقل کیا گیا ہے براہ راست ایڈیٹر "اودھ اخبار" کو نہیں بھیجا گیا۔ اس مضمون کو نقل کرتے ہوئے ادارہ اودھ اخبار نے " ہندوستان کی سمجھ " کے عنوان سے ایک نوٹ بھی لکھا ہے جو درج ذیل ہے۔

" افغانستان کا روزنامچہ مدت دراز سے سُنا جاتا ہے۔ دس برس سے زیادہ ہوئے کہ صحائف اخبار میں دیکھا جاتا ہے۔ غرض سالہا سال گزر گئے سُنتے سُنتے کان بھر گئے کسی امر کا ظہور نہ پایا۔ افسانے کے سوا کچھ نظر نہ آیا ان دنوں بھی ویسی ہی باتوں نے شہرتیں پائیں چاروں طرف لوگوں نے بے پر کی اُڑائیں۔ ہندوستانیوں کی سمجھ کے قربان! کیا کیا عقلیں کیسے کیسے نشان نئے نئے باندھنو باندھے۔ توطے اُٹھائے محض اپنے گمان سے قیاس لگائے۔

اے بے فکرو خدا سے ڈرو۔ ناحق عالم کو پریشان نہ کرو معلوم نہیں کہ یہ بے اصل باتیں کون گڑھا کرتا ہے ......
...... انگریزوں کو کون لکھا کرتا ہے ....

اخبارات سے مملو پاتے ہیں تو ہم بھی "حسب ضرورت" کچھ کچھ انتخاب کر کے اپنے صحیفے میں چھپواتے ہیں آج کل دانائے روزگار۔ سر آمد اولی الابصار۔ ارسطو فطرت۔ فلاطون فطنت جناب والا شان عالی مناقب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ نے جن کے سلامت ذہن مستقیم پر قسم کھائیے استقامت رائے سلیم کے صدقے جائیے۔ نافہموں کی فہمائش میں ایک

نثر تحریر فرمائی۔ ہمارے مضمون خیالی سے توارد ہوا ایسی تقریر فرمائی ہم اس کو درجِ اخبار کرتے ہیں۔ اہل جہاں پر آشکار کرتے ہیں بعد اس کے بھی جو خبریں ملا کریں گی پیش کشِ ناظرین مشتاق ہوا کریں گی . . !"

اس طویل تمہید کے بعد "نثر" کے زیرِ عنوان غالب کا وہ مضمون درج کیا گیا ہے جسے غالبؔ کی ایک نیم سیاسی ادبی تحریر کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ ۱۸۶۲ء تک اگرچہ غالبؔ کے اسلوب تحریر پر سادگی اور پرکاری کا عنصر غالب ہو چکا تھا لیکن اس مضمون میں وہی مقفیٰ مسجع عبارت آرائی موجود ہے جو قدیم طرزِ نگارش کا ایک خاص انداز تھا۔

ذیل میں غالبؔ کے اس نادر اور تاریخی مضمون کو بلا کم و کاست نقل کیا جا رہا ہے جو یقیناً "غالبیات" کے موضوع میں ایک اہم تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

"یارب دنیا میں جتنے تیرے بندے ہیں سب اپنا بھلا چاہتے ہیں۔ آیا یہ کج فہم واقعہ طلب لوگ کیا چاہتے ہیں؟ فتنہ و فساد سے خوش اور امن و امان کے دشمن ہیں گویا زبان و فرزند و مال و جان کے دشمن ہیں۔ اگرچہ اس ہنگامے میں آپ بھی برباد ہوتے ہیں لیکن جہاں ہنگامے کی خبر سنتے ہیں شاد ہوتے ہیں۔ ابھی سرزمینِ ہند کو موج زن دریا میں سرنگوں دیکھ چکے ہیں۔ یہ یہ عافیت دشمن ہجرت نہیں پکڑتے ہیں اور جو کوئی ان کو سمجھائے تو اس سے جھگڑتے ہیں۔ کابل کے اخبار پر کس رغبت سے کان دھرتے ہیں۔ اور پھر اس اخبار پر کیا کیا آثار مترتب کرتے ہیں۔ سرکار انگریزی کو از بسکہ توجہ طرف رفاہ عام کے ہے ادھر کا خیال یا قصد جو کچھ ہے واسطے انتظام کے ہے بفرض محال اگر اس گروہ میں کسی نے

بڑھ کر حوصلہ کیا اور صاحبان عالیشان معدلت نشان کا
مقابلہ کیا۔ بات صاف صاف ہے۔ ــــــــــــــــ
جائے انصاف ہے۔ جن مؤیدمن اللہ حاکموں نے اپنی فوج
باغی کو صرف اپنے حسنِ تدبیر وضربِ شمشیر سے زیر کیا ہے
اب جو یہ فوج جرّار ولشکرِ بے شمار ساتھ ہے۔ مخالفت کا
دفع کرنا مشکل کیا ہے؟ ہندو مسلمان جو اہلِ ہند اگلے فتنہ و
فساد سے بچ رہے ہیں اور بعد اس کے وبا اور قحط کے دُکھ
سہے ہیں وہ اپنی علامت وصحت پر خدا کا شکر بجالائیں نیا
پاکیزہ سستا اناج فراغت سے کھائیں۔ اگن بوٹ اور
ریل گاڑی کی صفت کو دیکھیں تار بجلی میں پیام بھیجنے کی
سُرعت کو دیکھیں۔ مدرسوں کی رونق اور رواجِ علم کی کثرت
ملاحظہ فرمائیں۔ حکام کی مہربانیاں اپنی نسبت ملاحظہ فرمائیں
ملک سراسر بے خس وخار ہو گیا ہے قلمروِ ہند نمونہ گلزار ہو گیا
ہے۔ بہشت اور بیکنٹھ جو مرنے کے بعد متصور تھا اب زندگی میں
موجود ہے وہ احمق ہے وہ ناقدردان ہے جو انگریزی عملداری
سے ناخشنود ہے حکام کو ملک کی آبادی اور رعیت کی آسودگی
منظور بہر صورت ہے اگر احیاناً کوئی اپنے حق کو نہ پوچھے تو اس
شخص کی خوبی قسمت ہے۔ آدمی زحمتِ خاص کو نہ دیکھے
رحمتِ عام پر نظر کرے اگر اس کا کوئی مدعا حاصل نہ ہو تو
اپنے بخت و قسمت کا گلا کرے۔"

امن و امان کا طالب۔ بخت و قسمت کا شاکی۔ "غالبؔ"۔ فقط

غالبؔ کی اس عبارت میں نہ کوئی سیاسی تنوع ہے نہ کسی قسم کا ایسا انقلابی رجحان! جس کی مثالیں ۱۸۵۷ء میں سامنے آچکی تھیں پھر بھی اسے پڑھ کر یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان میں جس قسم کے سیاسی رجحانات کی نشو و نما ہو رہی تھی غالبؔ بھی ان نعروں سے ہم آواز ہونا چاہتے تھے۔ اور یہ بالکل فطری بات تھی کیونکہ ان کے مادی وسائل کے تمام سوتے انھیں امرا، جاگیردار اور والیان ملک کے خزانوں سے جاری تھے۔ جو انگریزوں کے سب سے بڑے دوست حلیف اور وفادار تھے۔

نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں

نسخۂ حمیدیہ اور میاں فوجدار محمد خاں

جب تک غالبؔ کا آرٹ اور فن زندہ ہے "نسخۂ حمیدیہ" کا نام جاوداں رہے گا۔ یہ اور بات ہے کہ اس غیر ادبی اور خالص سیاسی نام کے پس منظر میں ایک ایسی اہم شخصیت کی "موت" کا راز پنہاں ہے جو غالبؔ کے اوّلیں قدر شناسوں اور پرستاروں میں سرِ فہرست نظر آتا ہے۔! اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ" نواب فوجدار محمد خان" اپنے عہد کی وہ منفرد شخصیت تھے جنھوں نے غالبؔ کے فن اور آرٹ کو اس وقت پرکھا جب غالبؔ کے خلاف ایک انقلابی قسم کا نعرہ جنم پا چکا تھا۔

"مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے"

جس زمانے کا یہ ذکر ہے ہندوستان میں مغل اقتدار بھی باقی تھا اور اودھ بھی! حیدرآباد بھی بھوپال بھی، رامپور بھی ٹونک بھی! لیکن مشکل پسند غالبؔ کی شنوائی کہیں نہیں ہوئی غالبؔ کے اس "ناقابل فہم فن" کو قبول کیا تو بھوپال کے ایک لٹے ہوئے چھوٹے سے رئیس نے، جو تاج و اقتدار سے محروم ہو چکا تھا۔ اور یہ جاہ پرست دنیا اس کے نام سے متنفر و بیزار ہو چکی تھی برسہا برس کے بعد جب اس کی کمائی ہوئی دولت کا یہ دفینہ ہاتھ آیا تو بھوپال کے برسرِ اقتدار، فرمانروا، نواب حمید اللہ خاں مرحوم کے نام سے نسبت دینے کے بعد بھی مفتی انوار الحق مرحوم ڈرتے ڈرتے صرف اتنا لکھ سکے:۔

" اس نایاب کتاب کو محفوظ رکھنے کا شرف کتب خانہ حمیدیہ بھوپال کو حاصل ہے۔ یہ تو یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ یہ دیوان یہاں بھوپال، کیونکر پہنچا! لیکن تاریخ کتابت اور مہروں وغیرہ سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ یہ غالبؔ رئیسِ وقت

نواب غوث محمد خان کے بیٹے " میاں فوجدار محمد خاں صاحب "
کے لئے لکھا گیا تھا چنانچہ اس کے شروع میں ایک صفحہ پر
یہ لکھا ہوا ہے :

" دیوان ہٰذا من تصنیف مرزا نوشہ دہلوی المتخلص بہ
اسد - از کتب خانہ سرکار فیض آثار عالی جاہ عالم پناہ میاں
فوجدار محمد خان بہادر دام اقبالہٗ قلمی خوشخط "

اور اس کے سامنے ان (نواب فوجدار محمد خاں) کی مہر ہے
اور خاتمہ پر کاتب کے قلم کی یہ تحریر موجود ہے :-

" دیوان من تصنیف مرزا صاحب قبلہ المتخلص بہ
" اسد و غالب " سلمہم ربہم علی ید العبد المذنب حافظ
معین الدین بتاریخ پنجم شہر صفر مظفر ۱۲۳۷ھ من الہجرت
النبویہ صورت اتمام یافتہ "

اس کا خط نہایت پاکیزہ اور نظر فریب ہے - شروع
میں خوبصورت طلائی کام ہو رہا ہے اور تمام صفحات پر
سنہری جدول ہے جگہ جگہ میاں فوجدار خاں کی مہریں
ثبت ہیں جن میں سے بعض ۱۲۴۸ھ اور بعض ۱۲۶۱ھ
کی ہیں " (صفحہ ۵ - ۶ - تمہید نسخہ حمیدیہ)

گویا مفتی انوار الحق مرحوم کو ان اسناد کے بعد بھی اس تیقن میں پس و پیش تھا کہ یہ دیوان میاں فوجدار محمد خان کے لئے تحریر کیا گیا تھا چنانچہ " غالباً " کی یہ غیر یقینی اور مشکوک کیفیت اس کی غماز ہے - اور تھا بھی مفتی صاحب مرحوم کے لئے یہ دشوار! کیونکہ اُن کے " خداوند نعمت " ہز ہائی نس نواب حمید اللہ خان مرحوم نے اپنے " سرنامہ " (نسخہ حمیدیہ) میں نواب فوجدار محمد خان کا نام تک لینا گوارا نہیں کیا تھا - ورنہ جہاں تک ان حقائق کا تعلق ہے اس زمانے کا بھوپال ان شخصیات سے خالی نہیں تھا جنھیں اس دیوان کے

بھوپال پہنچنے کی پوری تاریخ سے آگاہی اور باخبری تھی۔ تلامذۂ غالب میں ابوالفضل مرزا محمد عباس رفعتؔ شروانی اور خان محمد خان شہیرؔ اس وقت تک ضرور مر چکے تھے پھر بھی ذکی مارہروی وفات ۱۹۳۰ء بھوپال ہی میں موجود تھے اور حکیم معشوق علی خاں جوہرؔ شاہجہانپوری (وفات ۱۹۲۸ء) حیدر آباد دکن میں بقیدِ حیات تھے۔ ان سے تو بہر حال کچھ نہ کچھ تفصیلات معلوم کی جا سکتی تھیں۔ پھر یہ بھی نہیں تھا کہ مفتی صاحب نے میاں فوجدار محمد خان کے فرزند ارجمند اور غالب کے شاگرد میاں یار محمد خان شوکتؔ (وفات ۱۹۱۲ء) کا زمانہ نہ پایا ہو۔ یا میاں عالمگیر محمد خان (وفات ۵۶ - ۱۹۵۵ء) اور میاں ارجمند محمد خان سلیمؔ بھوپالی (وفات تخمیناً ۱۹۵۶ء) کو نہ دیکھا ہو جو گذشتہ بھوپال کی زندہ تاریخ تھے۔

یہ دیوان (مکتوبہ یکم نومبر ۱۸۲۱ء) اپنے سن کتابت کے تخمیناً سو برس کے اندر ڈاکٹر بجنوری (وفات نومبر ۱۹۱۸ء) کی زندگی میں دستیاب ہو گیا تھا۔ لیکن اسے طباعت و اشاعت کی منازل طے کرتے کرتے ایک صدی (سن کتابت سے) کچھ زیادہ ہی زمانہ گزارنا پڑا یعنی ۱۹۲۱ء کے بعد ہی اس کی اشاعت کی نوبت آئی۔ پھر بھی یہ زمانہ وہ تھا کہ بھوپال میں بکثرت ایسے معمّر افراد موجود تھے جنھوں نے میاں فوجدار محمد خان کا عظیم الشان کتب خانہ بھی دیکھا تھا اور اس دیوان (غالب) کے بھوپال پہنچنے کی تفصیلات سے بھی واقف تھے۔ انھیں باخبر ارباب علم و ادب میں ایک جناب محمد یوسف قیصرؔ بھوپالی بھی ہیں جنھوں نے ابھی ۱۹۵۶ء میں میاں فوجدار محمد خان کے اس کتب خانہ کا تفصیلی حال بھی بیان کیا ہے اور "نسخہ حمیدیہ" کے بھوپال پہنچنے کا واقعہ بھی:

> "فوجدار محمد خان کا کتب خانہ ہندوستان کے ان کتب خانوں میں تھا جن کو آج تک انگلیوں پر گنا کرتے ہیں۔ بیشمار قلمی نسخے تھے۔ فوجدار محمد خان کو کتابوں سے عشق تھا — ہندوستان بھر میں جہاں کہیں بھی اچھی کتاب سُن پاتے تھے بیقرار ہو جاتے تھے اور جب تک وہ کتاب یا اس کی نقل ان کے کتب خانے میں نہ آ جائے ان کو چین نہیں آتا تھا

ان کی دولت و امارت کا بھی یہی ایک مصرف تھا، ان کے بہت سے ایجنٹ ہندوستان میں دورے کرتے تھے اور جب کہیں کوئی اچھی کتاب دیکھتے اس کو خریدنے کی کوشش کرتے اور اگر یوں نہیں ملتی تو اس کی نقل کرائی جاتی اور مالک کتاب کو اس کتاب کی نقل کرائی کی اجازت کا کافی صلہ دیا جاتا۔ ان کے یہاں بہت سے خوشنویس اور خطاط مستقل ملازم تھے جو کتابت کا کام کیا کرتے تھے۔ کوئی موضوع علم و فن کا ایسا نہیں تھا جس کے دو چار نسخے یہاں نہ ہوں۔ غرضیکہ ان کا کتب خانہ لاجواب تھا۔

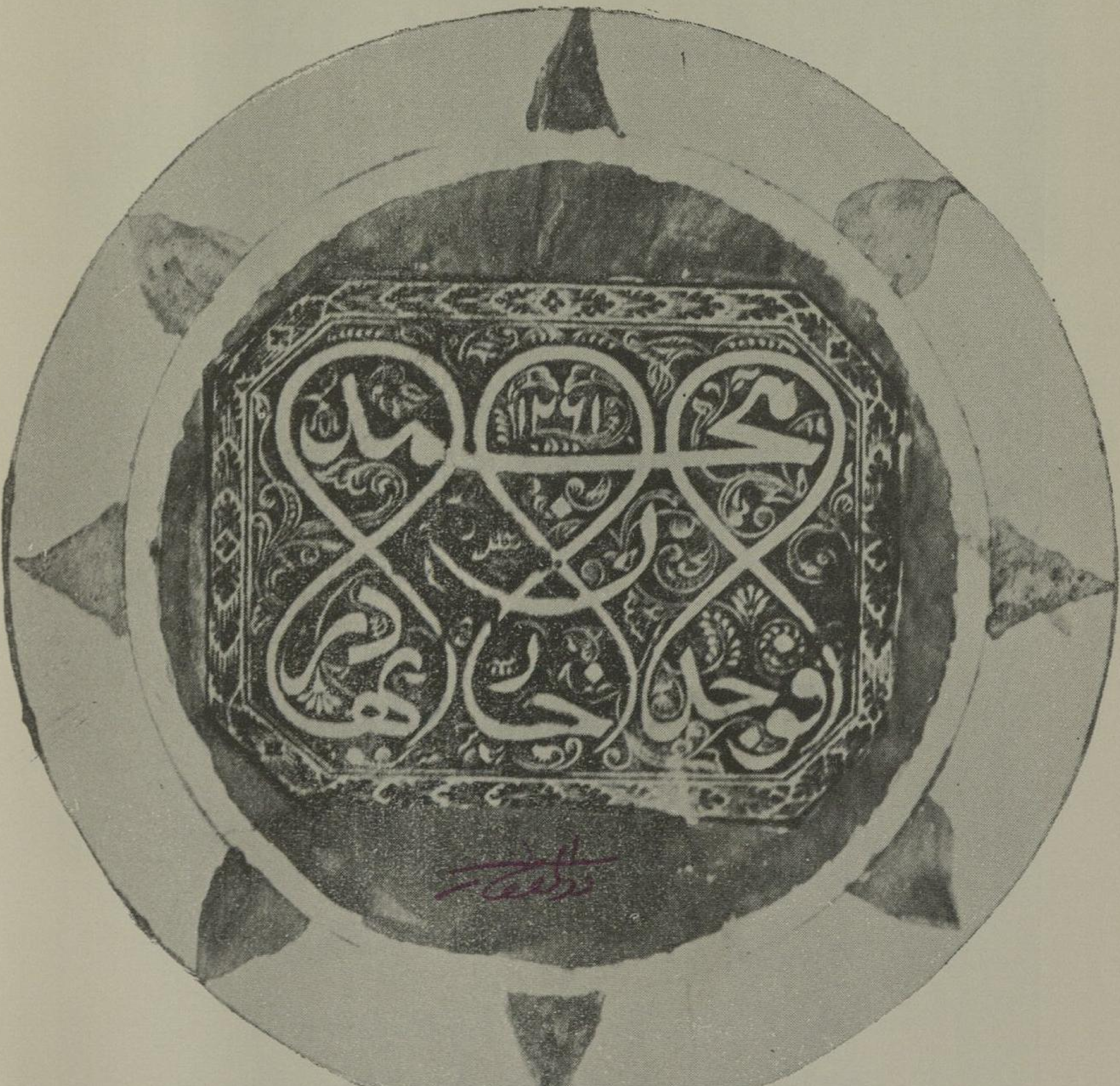
فوجدار محمد خان کو کتابیں جمع کرنے کا شوق ہی نہیں تھا بلکہ ان کے اوقاتِ فرصت کا مشغلہ بھی ایک کتب بینی تھا۔ ان کے انتقال کے بعد اس کتب خانے کا جو حشر ہوا اسکو سُن کر آنسو نکل پڑتے ہیں۔ جہاں (اب) "حمیدیہ ہاسٹل" ہے، اُس کے جنوبی حصے میں ان کا "محل" تھا (اب) اس حصے میں کچھ کوارٹر ڈاکٹروں اور نرسوں کے بن گئے ہیں۔ ان کے "محل" کی بارہ دری کا کچھ حصہ اور محل کے آس پاس کی کچھ دیواریں اب بھی باقی ہیں، بلکہ بارہ دری کے بالائی حصے کو کوارٹرس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ یہیں وہ رہتے تھے اور یہیں ان کا کتب خانہ تھا جب ان کا انتقال ہوا تو ان کا تمام سامان اسی جگہ چھوڑ دیا گیا اور اس کی کچھ پاسبانی بھی نہیں کی گئی بلکہ دانستہ اس جگہ کو سنسان اور غیر محفوظ کر دیا گیا۔ نتیجہ میں جہاں ان کا بہت سا اور سامان چوری ہو گیا وہاں اُن کی کتابیں بھی لوگ اُٹھا اُٹھا کر لے گئے۔ یہ وہ

(1)



کتبخانہ میاں فوجدار محمد خان کے ۲ دو کارنامے

(2)



کتابیں تھیں کہ ایک ایک کتاب نقل کرانے میں سیکڑوں روپیہ بلکہ ہزاروں روپیہ صرف ہوا تھا۔ جب یار محمد خان (شوکت) (ابن میاں فوجدار محمد خان) کو بہت سمجھایا گیا تو انھوں نے اس ذخیرے کو وہاں سے منگوا کر اپنے یہاں (لکھیرہ پورہ میں) ایک کمرے میں بھر دیا اور وہ ایک مدت تک وہاں پڑا ہوا دیمک کی نذر ہوتا رہا۔ سرکار نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد میں "سرکار" نے یار محمد خان شوکتؔ کے انتقال (۱۹۱۲ء) کے بعد وہ ذخیرہ اپنے محل پر منگوا لیا وہاں بھی ایک عرصہ تک غیر محفوظ حالت میں پڑا رہا۔ آنے جانے والے اس طرف سے گزرتے اور دو چار کتابیں اُٹھا کر لیجاتے۔ پھر اس میں سے کچھ حصّہ تو سرکار نے اپنے ذاتی کتب خانے میں رکھ لیا اور باقی حمیدیہ لائبریری میں بھیجدیا جس کا نام اب سینٹرل لائبریری ہے۔ انکی کتابیں بھوپال میں بھی بعض لوگوں کے پاس ہیں اور زیادہ تر کتابیں بھوپال سے باہر چلی گئیں۔"

("غالبؔ کے پانچ شاگرد" قسط ۲ مطبوعہ "روزنامہ ندیم" بھوپال ۵ فروری ۱۹۵۶ء)

غالبؔ کے اُردو اور فارسی کلام کے جتنے قلمی مجموعے اب تک دستیاب ہوئے ہیں ان میں اس اُردو دیوان کو اولیّت کا شرف حاصل ہے ۱۸۲۱ء کا مخطوطہ ہے۔ اُردو دیوان کا دوسرا قدیم مخطوطہ خان بہادر سید ابو محمد مرحوم کے کتب خانے میں تھا جس کا سنِ کتابت ۱۸۴۱ء بیان کیا جاتا ہے۔ اور رامپور اسٹیٹ کا قلمی نسخہ تو اس کے بہت بعد کا ہے یعنی ۱۸۵۶ء یا ۱۸۳۷ء کا مکتوبہ۔ فارسی نظم و نثر کے مخطوطات میں "میخانۂ آرزو" قدیم ترین ہے جو ۱۸۳۷ء کا مخطوطہ ہے اور پٹنہ کی خدا بخش لائبریری میں محفوظ ہے۔ متفرق بیاضوں کو

چھوڑ کر غالبؔ کے اُردو کلام کا یہ مجموعہ ہی اُردو کا سب سے زیادہ قدیم دیوان ہے جو بقول شیخ محمد اکرام، غالبؔ کی ابتدائے مشقِ سخن ۱۸۰۷ء (۹) (۱۸۲۱ء) سے تعلق رکھتا ہے۔

"اس دَور میں ان اشعار کا انتخاب ہے جو پچیس برس کی عمر سے پہلے لکھے جا چکے تھے اور "نسخۂ حمیدیہ" کے متن میں موجود ہیں... اس دَور کے اشعار کو مفتی انوار الحق نے نے بھی باقی اشعار سے علٰحدہ شائع کیا ہے۔"

اور انہی حقائق کو سامنے رکھ کر یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ میاں فوجدار محمد خان وہ پہلے "غالبؔ شناس" تھے جنھوں نے غالبؔ کے اس اُردو کلام کی پذیرائی کی جسے غالبؔ کے مخلص دوست اور محسن علامہ فضل حق خیر آبادی اور دوسرے احباب نے عام مذاق سے ہٹا ہوا قرار دے کر نا قابلِ انتخاب قرار دیا تھا۔ اور ان کا اندازہ غلط بھی نہیں تھا۔ "نسخۂ حمیدیہ" کو وہ قبول عام آج تک حاصل نہ ہو سکا جو اس مروّجہ مطبوعہ دیوان کو حاصل ہے جس کے کئی ایڈیشن خود غالبؔ کی زندگی میں چھپ چکے تھے۔

میاں فوجدار محمد خان بھوپال کے اس فرمانروا خاندان کے ایک ممتاز رکن تھے جس کی بنیاد سردار دوست محمد خان نے ۱۷۲۳ء میں ڈالی تھی۔ سردار دوست محمد خان کے بعد زمامِ حکومت ان کے بیٹے نواب یار محمد خان کے ہاتھ میں آئی اور ان کی وفات کے بعد ان کے بڑے بیٹے نواب فیض محمد خان فرمانروا ہوئے۔ فیض محمد خاں چونکہ لاولد تھے اسلئے ان کے مرنے کے بعد حیات محمد خان اور پھر اُن کے فرزند نواب غوث محمد خان مسند آرائے تختِ سلطنت ہوئے۔ میاں فوجدار محمد خاں انھیں نواب غوث محمد خان کے دوسرے بیٹے تھے۔ ان کے حقیقی بھائی بہنوں میں ان کے بڑے بھائی نواب معز محمد خان اور ایک بہن نواب قدسیہ بیگم تھیں جن کی شادی نواب غوث محمد خان نے اپنے رشتہ کے بھتیجے نظیر محمد خان (بن وزیر الدولہ وزیر محمد خان) کے ساتھ کر کے اپنا "مختارِ کُل" بنا دیا تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب "ایسٹ انڈیا کمپنی" تقریباً تمام ہندوستان میں "معاہدں کا سنہرا جال" بچھا کر ہر چھوٹی بڑی ریاست میں انتشار پیدا کر رہی تھی۔ میسور اور بنگال

پر انگریزوں کا کامل تسلط ہو چکا تھا۔ دکن اور کرناٹک بھی کمپنی کی بالادستی کے چنگل میں پھنس چکے تھے۔ اودھ میں ان کی سازشوں کی چنگاریاں سلگ ہی رہی تھیں اور دہلی کا تخت و تاج تو گویا ایسٹ انڈیا کمپنی کے چشم و ابرو کا محتاج ہی تھا! سنٹرل انڈیا کی یہ چھوٹی ریاست بھلا انگریزوں کی ریشہ دوانیوں سے کس طرح محفوظ رہتی چنانچہ نواب فیض محمد خاں کی وفات کے بعد ان کے چھوٹے بھائی نواب حیات محمد خاں ۱۱۹۲ھ میں جب مسند نشین ہوئے تو جنرل گڈرڈ "نے بھوپال پہنچ کر معاہدہ کا پہلا پھندہ بھوپال کے گلے میں ڈال ہی دیا۔ یہ معاہدہ دراصل سازشوں کا ایک "بگل" تھا اس کے بعد ہی انگریزوں نے ریاست کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرنا شروع کر دی۔ ۱۸۰۶ء میں نواب حیات محمد خان کا انتقال ہوا اور یہی وہ منحوس سال تھا جب کمپنی نے "معاہدہ لیک" کرکے مغل اقتدار کے تابوت میں آخری کیل بھی گاڑ دی تھی۔ دہلی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد انگریزوں نے اپنی سرگرمیاں اور تیز کر دیں۔ کمپنی کے تنخواہ دار ایجنٹ ایک طرف تو ہندوستان کے مختلف حصوں میں خانہ جنگی پھیلانے میں مصروف تھے دوسرے ان کے چالاک فوجی جنرل اپنی سپاہ کی مدد سے معاہدوں کا جال بچھاتے پھر رہے تھے۔ ۱۸۱۸ء میں "جنرل اوڈلم" اسی سلسلہ میں ہوشنگ آباد پہنچا۔ نواب غوث محمد خان کو ان آمد کی اطلاع دی گئی۔ یہ خود تو نہیں گئے اپنے بجائے اپنے داماد اور "مختار کل" نظر محمد خان کو ہوشنگ آباد بھیجدیا۔ نظر محمد خاں نے یہاں پہنچ کر ایک نیا گُل کھلایا۔ انگریز جنرل سے سازش کرکے ایک نیا معاہدہ بجائے نواب غوث محمد خاں کے اپنے نام سے کر لیا اور اس معاہدہ کی رو سے ریاست بھوپال کو اپنی موروثی جائداد قرار دے لیا۔ بہت دنوں تک نظر محمد خان نے اس معاہدہ کو چھپائے رکھا۔ لیکن کہاں تک چھپاتے آخر کار راز کھل کر رہا اور نظر محمد خان کو اسلام نگر کے قلعہ میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

نواب غوث محمد خان ایک رحم دل اور جذباتی انسان تھے۔ داماد کی اس موت کا انھیں بہت ہی صدمہ ہوا اور اپنی نوعمر بیٹی کے سہاگ اجڑنے کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ انھوں نے اپنی اولاد نرینہ کو محروم کرکے اپنی بیوہ بیٹی نواب قدسیہ بیگم کو اپنا جانشین بنا دیا۔

بھوپال کا یہ پہلا انقلاب تھا جس نے فرمانروا خاندان کے ہاتھ سے عنان اقتدار چھین کر دوسرے خاندان میں منتقل کر دی۔

نواب غوث محمد خان نے ۱۸۲۳ء میں رحلت کی۔ اُن کے بڑے بیٹے نواب فوجدار محمد خان بظاہر تو تخت نشین کیے گئے لیکن ان کی بہن قدسیہ بیگم اپنے حقوق سے دستبردار نہیں ہوئیں اور رفتہ رفتہ انھیں اس "معمولی جاگیر" میں محدود و محصور کر دیا گیا جو مرحوم نواب غوث محمد خان کے ذاتی جاگیر اور جیب خرچ سے تعلق رکھتی تھی۔ اور پھر والاجاہ نواب صدیق حسن خان کے عہد تک اس "جاگیر" کے بہت بڑے حصے سے بھی ان کی اولاد کو محروم کر دیا گیا۔

میاں فوجدار محمد خان انھیں نواب معز محمد خان اور پہلی خاتون فرمانروا نواب قدسیہ بیگم کے حقیقی بھائی تھے۔ ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ تو خود ان کے باپ نواب غوث محمد خان کے ہاتھوں ہی ہو چکا تھا، رہا سہا اقتدار اور اعزاز دھیرے دھیرے نئے حکمران ختم کرتے چلے گئے۔ سیاسی دور اندیشی کے خیال سے انھیں دو مرتبہ برائے نام "مختار کل" کا عہدہ بھی دیا گیا۔ مگر وہ ایک قسم کی سیاسی چال تھی۔ اس لئے بھوپال کی سیاسی تاریخوں نے ان کے اس عہد کو ہمیشہ تاریکِ زمانہ قرار دیا۔ چنانچہ "تاریخ الکہ بھوپال" کا بے لاگ مؤرخ بھی اپنے پیشرؤں کے آگے بے بس ہو کر یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا۔

> "میاں فوجدار محمد خان مختاری سے جان چراتے تھے۔ قاضی حنیف ساکن دوراہہ نے جو کہ میاں موصوف کے بڑے خیر خواہ تھے یہ اپنی خواہش پوری کی، جب کہ میاں موصوف کی کم توجہی کاروبار ریاست میں پائی گئی اور انتظام میں خلل پڑا تو گورنمنٹ (برطانیہ) نے سکندر بیگم کو معین انجام امور ریاست کیا۔ آخر سکندر بیگم نے اپنی تدبیر اور کوشش سے وہ کاروائی کی کہ فوجدار محمد خان کو صاف مٹا دیا "خود مختار" بن گئیں۔ گورنمنٹ نے میاں موصوف

سے استعفیٰ لیا۔ ان کی حکومت صرف آٹھ دس ماہ رہی"

اسی صفحہ (۵۹) کے حاشیہ پر ہی میاں فوجدار محمد خاں کا ذکر کیا گیا ہے۔

" یہ بڑے ہوشیار و چالاک تھے لیکن اس وقت اس کام میں انھوں نے ایسی کم توجہی اور کم ہمتی کا کام فرمایا کہ جس سے ان پر حرف آیا یا قسمت کا لکھا آگے آیا اور ادبار نے منہ دکھایا۔ گئی ہوئی حکومت کی امید نے منہ دکھایا تھا۔ اس کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا۔ ان کی چالیس ہزار کی جاگیر تھی اور انتظامِ خانگی بہت عمدہ۔ ہر چیز قابل تعریف۔ علوم عقلی و نقلی کے سوا اکثر فنون میں ماہر تھے۔ بعد توبہ نصوح حج کیا۔ لوٹ کر آئے اور چھ ماہ کے بعد انتقال کیا "نیک آخرت" (۱۲۸۱ھ) تاریخ وفات ہے۔"

صفحہ (۵۹۔ تاریخ الکہ بھوپال مطبوعہ مطبع عالیجاہ لشکر گوالیار ۱۳۱۳ھ)

میاں فوجدار محمد خاں کی سیاسی زندگی کے یہی دھندلے نقوش ہیں جو کم و بیش تاریخوں میں ملتے ہیں۔ لیکن ان سطور سے نہ تو ان کی معارف پروری پر کوئی خاص روشنی پڑتی ہے اور نہ شعری فن سے وابستگی یا دلچسپی کا ہی کوئی ثبوت ملتا ہے۔ اس سلسلے میں ہماری تھوڑی بہت رہنمائی صرف بھوپال کے بزرگ صحافی، ادیب اور نگار جناب قیصر بھوپالی کے وہی مضامین کرتے ہیں جو ابھی چند سال ہوئے شائع ہوئے تھے۔ جناب قیصر بھوپالی میاں فوجدار محمد خاں مرحوم کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:۔

" فوجدار محمد خاں غالب کی شاعری اور ان کی جدّتِ افکار سے اس قدر متاثر ہوئے کہ مرزا سے ملنے کے لئے دہلی پہنچے اور کچھ دنوں تک ان کے پاس رہے۔ بادشاہ کے یہاں مشاعروں میں بھی شریک ہوئے اور مرزا سے

ایک خصوصی مراسم کا تحفہ (نسخہ حمیدیہ) لے کر بھوپال
واپس آ گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ غالبؔ کے شاگرد بھی ہو گئے
تھے مگر اس کی آج تک کوئی تصدیق نہیں ہوئی۔ اس
میں کوئی شک نہیں کہ وہ مرزا غالبؔ کے خیر اندیش دوستوں
میں ضرور شامل تھے اور ان سے مراسلت بھی بکثرت تھی۔
لیکن آج تک فوجدار محمد خان کا ایک مصرعہ بھی سننے
میں نہیں آیا اور نہ کسی تذکرے میں نظر سے گزرا۔ ظاہر
ہے کہ جب ان کے صاحبزادے نواب یار محمد خان شوکتؔ
تذکرہ "فرح بخش" لکھتے ہیں تو اپنے والد محترم کے اشعار سے
اسے کیوں محروم کرتے۔ وہ (میاں فوجدار محمد خان)
ذہین و طبّاع ضرور تھے اور ان کا مطالعہ بھی وسیع تھا،
وہ سخن فہم تھے۔ اور جہاں تک معلوم ہوا ہے "سخن سنج"
نہیں تھے۔ شاعری سے لطف اندوز ضرور ہوتے تھے
مگر شاعر نہیں تھے۔ اور بھوپال میں سب سے پہلے وہی
شخص تھے جو غالبؔ کا کلام سُن کر جھوم اُٹھے اور بے ساختہ
غالبؔ کے قدموں پر جا کر گر پڑے، اور ان کے قدردان،
دوستوں کے زمرے میں داخل ہو گئے۔"

("غالبؔ کے پانچ شاگرد" قسط ۱ مطبوعہ روزنامہ "ندیم" بھوپال۔ ۵ فروری
۱۹۵۶ء)

جناب مالکؔ رام نے بھی میاں فوجدار محمد خان کا ذکر اپنی روایتی احتیاط کے
ساتھ کیا ہے۔ نواب یار محمد خان شوکتؔ بھوپالی کا ذکر کرتے ہوئے جناب مالک رام تحریر
فرماتے ہیں:۔

"غالبؔ کے تعلقات ان (شوکت) کے والد نواب

فوجدار محمد خان سے بہت دوستانہ تھے۔ غالبؔ کے قدیم اُردو کلام کا مجموعہ جو "نسخۂ حمیدیہ" کے نام سے شائع ہوا ہے انھیں کے کتب خانہ سے دستیاب ہوا تھا۔"

(تلامذۂ غالبؔ" صـ۱۷۲)

بی بی رشیدہ بھوپالی نے اپنے مضمون ("غالبؔ کے ایک غیر معروف شاگرد") میں لکھا ہے :-

"نواب فوجدار محمد خان بھوپال کی پہلی فرمانروا خاتون نواب گوہر بیگم (قدسیہ بیگم) کے حقیقی بھتیجے[1] اور ان کے والد ماجد نواب غوث محمد خان سردار دوست محمد خان (بانیٔ ریاست بھوپال) کے حقیقی پوتے تھے۔ نواب فوجدار محمد خان بھوپال کے وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کے ایک بڑے حصّے کو غیر سیاسی بنا کر علم و ادب کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ان کی کافی عمر ادبی مشاغل میں بسر ہوئی اور مرتے وقت اتنا بڑا کتب خانہ چھوڑا جس کی مثال "مالوہ" کیا اس زمانے میں دور دور نہیں ملتی تھی۔ وہ غالبؔ کے گہرے دوست ہی نہیں تھے بلکہ انھیں مرزا سے ایک قسم کا والہانہ عشق تھا۔ خط و کتابت سے "نصف ملاقات" کی منزلیں طے ہوئیں۔ اور پھر خود دلّی جا کر غالبؔ سے شرف ملاقات کی آرزو پوری کی۔

دیوانِ غالبؔ کا "نسخہ حمیدیہ" جسے ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم نے ترتیب دیا تھا۔ اور ان کے مرنے کے بعد گورنمنٹ بھوپال نے شائع کیا، انھیں نواب فوجدار محمد خاں

---

[1] نواب فوجدار محمد خان نواب قدسیہ بیگم کے حقیقی بھائی تھے بھتیجے نہیں۔ (ن-س)

کے ان تعلقات خصوصی کی یادگار تھا جو اُن سے اور غالبؔ سے تھے۔ نواب فوجدار محمد خان نے اپنا ذاتی خوشنویس دلّی بھیج کر غالبؔ کا یہ دیوان نقل کرایا تھا جو اُن کے کتب خانے کی تباہی کے بعد گورنمنٹ بھوپال کے قبضہ میں پہنچا اور پھر ڈاکٹر بجنوری کے ہاتھوں "خدا بخش لائبریری" (پٹنہ) پہنچ گیا اور بھوپال ایک گرانمایہ ادبی تحفے سے محروم ہوگیا۔"[1]

(صفحہ ۴۷، ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ جمہوریت نمبر ۱۹۵۸ء)

نسخۂ حمیدیہ کا اصلی مخطوطہ تو اب تک میری نظر سے نہیں گذرا لیکن میاں فوجدار محمد خان کے عظیم کتب خانے کے متعلق بے شمار روایتیں بھوپال کے زمانے قیام میں "تواترات" کے ساتھ مجھ تک پہنچیں۔ اور اس کتب خانے کی بہت سی قلمی کتابیں دیکھنے میں بھی آئیں۔ سینٹرل لائبریری بھوپال جو حکومتِ ہند کے قبضے میں پہنچنے کے بعد اب "آزاد لائبریری" بنا دی گئی ہے اس کے شعبۂ مخطوطات میں میاں فوجدار محمد خان کے کتب خانے کی بہت سی قلمی کتابیں اب سے آٹھ دس برس ادھر تک موجود تھیں جن میں میرؔ، مصحفیؔ، انشاؔ اور جرأتؔ وغیرہ کے قلمی دیوان بھی تھے اور میرا قیاس یہ ہے کہ قلمی دیوان بھی میاں فوجدار محمد خاں نے اپنے خوشنویس دلّی بھیج کر نقل کرائے ہوں گے۔

جس زمانے میں بھوپال کی آزاد لائبریری میں ان قلمی کتابوں کے دیکھنے کا مجھے موقع ملا تھا، اس زمانے میں اس لائبریری سے مخطوطات کے سرقہ کی ایک باقاعدہ تحریک چل رہی تھی۔ میاں فوجدار محمد خان کے صاحبزادے میاں یار محمد خان شوکتؔ (تلمیذ غالبؔ) کے "گلدستۂ نرگس" کا قلمی نسخہ جس پر غالبؔ کی اصلاحیں تھیں خود میں نے دیکھا مگر چند روز کے بعد وہ غائب ہوگیا، اسی طرح دوسری کتابیں بھی چوری ہوگئیں۔

---

[1] اس کی کوئی تصدیق نہیں ہوئی کہ ڈاکٹر بجنوری کے ہاتھوں "نسخۂ حمیدیہ" پٹنہ کی خدا بخش لائبریری پہنچا اور وہاں موجود ہے۔ (ن۔س)

اور لائبریری کے ذمہ داروں نے مڑکر بھی نہیں دیکھا کیونکہ ہر "اُردو دشمن" تحریک سے خود اُنھیں بھی دلچسپی تھی۔ جب میں بھوپال پہنچا تو اس وقت میاں فوجدار محمد خاں کے کتب خانے کی عمارت بھی منہدم ہو چکی تھی۔ پرانے قلعے کے جانب جنوب بڑے تالاب کے کنارے اس عمارت کے کچھ آثار ضرور باقی تھے۔ اس کتب خانے کے مٹنے کی بے شمار روایتیں سننے میں آئیں۔ معلوم ہوا کہ فوجدار محمد خان نے جب "لکھیرے پورہ" میں اپنا محل بنوالیا تب بھی اس کتب خانے کا ایک بڑا حصہ پرانی ہی عمارت میں پڑا رہا جس کی بہت کچھ تفصیلات آپ سطور بالا میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔

جناب مالک رام نے "ذکر غالبؔ" میں جگہ جگہ روایات کا سہارا لینے کے باوجود غالبیات کی اس "اہم کڑی" کو غیر ضروری قرار دے کر نظر انداز کر دیا لیکن تعجب تو یہ ہے مولانا عرشی کی "ژرف نگاہی" نے بھی صرف "نسخہ بھوپال" کہہ کر غالبؔ کے پہلے اُردو دیوان کے مسئلہ کو قابل اعتنا نہیں سمجھا۔

غالبیات پر کام کرنے والے ان دونوں محققین کا یہ سکوت ہو سکتا ہے کہ آج زیادہ اہم نہ سمجھا جائے لیکن آنے والے تحقیقی دور میں اس "تشنگی" کے صرف ایک ہی معنی لئے جائیں گے اور وہ یہ کہ ان ارباب نظر کے نزدیک ان روایات کی کوئی اہمیت نہیں تھی جنکی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اُردو دیوانِ غالبؔ کا یہ پہلا نسخہ غالبؔ نے اپنے ایک ممتاز دوست میاں فوجدار محمد خان کی فرمائش پر لکھوا کر ان کی نذر کیا تھا۔ اور اس "اعتنا و اغماز" کے سلسلے میں جس استدلال کو آج بنیاد بنایا جائے گا، اس پس منظر کو بھی نگاہ میں رکھنا چاہئے کہ اس کا جواب صرف یہی دیا جائے گا کہ غالبؔ کے خطوط اور دوسری تحریروں سے اس کا ثبوت نہیں ملتا کہ ان کے دوستوں میں فوجدار محمد خان بھی کوئی شخص گزرے ہیں۔ اور صحیح یہ بھی ہے کہ غالبؔ کے خطوط و مکاتیب کے جو مجموعے اب تک سامنے آسکے ہیں، ان میں کہیں بھی میاں فوجدار محمد خان کا نام نہیں ملتا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالبؔ کے بھوپالی شاگردوں میں سوائے ابوالفضل مرزا محمد عباس رفعتؔ شروانی کے آج تک نہ کوئی خطوط خان محمد خان شہیرؔ نہ حکیم معشوق علی خان جوہرؔ۔

نہ حکیم شفاق حسین خان ذکی مارہروی اور نہ خود یار محمد خان شوکت کے نام سے سامنے آسکے ہیں۔ غالب کے مزاج اور طبیعت کو سمجھنے والے شاید ہی اسے باور کرسکیں کہ مرزا اور ان کے شاگردوں کے درمیان سلسلہ مراسلت نہ رہا ہوگا۔

سابق فرمانروائے بھوپال نے اگر خاندانی مناقشات اور رقابتوں کی وجہ سے اس دیوان کو "نسخۂ حمیدیہ" ہی تک محدود رکھنا مناسب سمجھا تب بھی ریسرچ و تحقیق کو " احتیاط و خوردہ گیری" کے سپرد نہیں کیا جاسکتا۔

غالب کا یہ پہلا اُردو دیوان کس طرح بھوپال پہنچا بھوپال کے معمر ادیب قیصر بھوپالی کا بیان ہے :-

" ان قلمی کتابوں ہی میں غالب کا وہ مکمل دیوان بھی تھا جس کا اس وقت تک انتخاب نہیں ہوا تھا۔ نہایت ہی خوشخط ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ غالب کا خط ہے وہ نستعلیق کے خوشنویس بھی تھے مگر ایسا کہنے والوں کا یہ حُسن ظن ہے۔ فوجدار محمد خان نے اپنے ایک خوشنویس کو بھیج کر اس کی نقل کرائی تھی اسی نقل کو غالب نے بطریق تصحیح دیکھا جہاں غلطی دیکھی اور دیکھتے وقت کسی مصرعہ یا شعر کا کوئی اچھا سا مضمون ذہن میں آگیا تو خوشخط کاٹ کر اپنے قلم سے پورا شعر یا مصرعہ لکھ دیا یا کوئی غزل لکھنے سے رہ گئی یا دورانِ کتابت میں کوئی تازہ غزل لکھی تو وہ ردیف کے اعتبار سے خوشخط دیوان کے صفحہ کے حاشیے پر اپنے قلم سے لکھ دی۔ اُن کا خط شکستہ تھا مگر اچھا تھا۔

حمیدیہ لائبریری میں اس دیوان پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کی نظر پڑی۔ وہ بھوپال میں مشیر تعلیمات تھے،

احمد آباد (بھوپال) میں رہا کرتے تھے۔ حمیدیہ لائبریری
بھی انھیں کی تفویض میں تھی۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی
سے غالبؔ کے شیدائیوں میں تھے۔ مکمل دیوان دیکھکر
اچھل پڑے۔ بوسہ دیا۔ آنکھوں سے لگالیا۔ سر پر رکھا
اور بنگلے پر لے آئے۔ ایک کاتب کو نوکر رکھا اور اس
سے دیوان کی کتابت کرائی۔ ایک نہایت ہی مبسوط مقدمہ
لکھا۔ یہ سب کام ابھی ہو رہا تھا کہ ڈاکٹر صاحب.....
اللہ کے پیارے ہوگئے۔ ان کے بعد یہ کام مفتی انوارالحق
ڈائرکٹر تعلیمات کے سپرد ہوا۔ کتابت ہوچکی تھی۔ مفتی صاحب
نے ایک دیباچہ لکھ کر کتاب میں شامل کر دیا۔ نواب
صاحب بھوپال نے بھی ایک پیش لفظ لکھ کر اس کو
شائع کر دیا۔ دیوان کا نام "نسخۂ حمیدیہ" رکھا گیا۔ ڈاکٹر
عبدالرحمٰن بجنوری اور مرزا غالبؔ کی تصویریں قلمی دیوان
کے ایک صفحہ کا فوٹو ہے۔"

("مرزا غالبؔ کے پانچ شاگرد" خط نمبر ا مطبوعہ روزنامہ
"ندیم" بھوپال ۵ رفروری ۱۹۵۶ء)

"نسخۂ حمیدیہ" کے بھوپال پہنچنے کی یہ تفصیلات اس معمر بزرگ ادیب وصحافی کا بیان ہے جس نے برسوں ڈاکٹر بجنوری۔ ڈاکٹر وارثی۔ مفتی انوارالحق۔ مولانا عبدالرزاق البرامکہ۔ سر راس مسعود اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ رہ کر ادبی خدمات انجام دی تھیں۔ اور نسخہ حمیدیہ" کی جدید ترتیب وتدوین اور اشاعت سے اتنا قریب تھا کہ اس کی بیان کی ہوئی روایات پر مبالغہ آرائی" کا شبہ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ قیصر بھوپالی کی عظمت کردار سے ذاتی طور پر مجھے ایک لگاؤ بھی رہا ہے اور میں پورے وثوق کے ساتھ ان روایات کا احترام کرتا ہوں جن کی تفصیلات پیش کی جاچکی ہیں۔ میاں فوجدار محمد خاں

کی قابل ذکر اولاد میں صرف نواب یار محمد خاں شوکت (۱۶ر جولائی ۱۸۳۳ء ۱۸ر اگست ۱۹۱۲ء) ایک خاص شہرت کے مالک تھے جن کا سرسری ذکر تذکرۂ "تلامذہ غالب" میں کیا گیا ہے۔ باپ کی طرح انھیں بھی مرزا غالب سے والہانہ عشق تھا۔ بہ نفس نفیس دلّی جاکر انھوں نے مرزا کے ہاتھ پر بیعت کی تھی اور غالب کے بھوپالی شاگردوں میں اپنا ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے۔ اور تذکروں کی سرزمین بھوپال میں ان کا تذکرہ "فرح بخش" پہلا تذکرہ ہے جو ۱۲۸۹ھ میں مطبع نظامی کانپور میں چھپا تھا۔

اصلاحاتِ غالبؔ

اصلاحاتِ غالبؔ

قطع نظر اس سے کہ غالبؔ نے "بے استادے" کی کڑوی طنز سے بچنے کے لیے ملا عبدالصمد ایرانی کی روایت کو سالہا سال زندہ رکھنے کے بعد ڈرامائی طور پر اچانک یہ طلسم کشائی کر دی کہ حقیقتاً اس نام کی کوئی شخصیت تھی ہی نہیں؟۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ "فنِ شعر" میں وہ کسی کے باقاعدہ شاگرد نہیں تھے، مولانا فضل حق خیرآبادی سے تھوڑا بہت "مشورہ سخن" جو تھا وہ بھی دوستانہ ہے اور ان کا یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ "مجھ کو مبداِ فیاض کے سوا کسی سے تلمذ نہیں ہے۔

غالبؔ اپنے کلام پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرتے رہتے تھے اور غالباً یہی وجہ تھی کہ ان کے مخالفین کا جتنا جتنا زور بڑھا، انکے کلام کی مقبولیت اور ہمہ گیری میں اتنا ہی اضافہ ہوتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ خود غالبؔ نے اپنے کلام میں جا بجا جو اصلاحیں کی ہیں، انھیں آج ان کے "ارتقائے فن" سے اتنا گہرا تعلق ہے کہ اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ غالبؔ کے کلام میں تحریف و تصرّف بھی کیا گیا، اور اپنی "سخن فہمی کی" پردہ پوشی کے لئے بعض شارحینِ غالبؔ نے شرح کرنے کے بجائے غالبؔ کے کلام پر بکثرت "اصلاحیں" بھی دے دی ہیں، جس طرح مولانا عبدالباری آسی مرحوم نے غالبؔ کے اردو کلام میں الحاقی کلام شامل کر کے ان کے فن کا مضحکہ اڑایا ہے، اسی طرح مجدّد السنۂ مشرقیہ مولانا احمد حسین شوکتؔ میرٹھی نے اپنی شرح (حل کلیات اُردو میرزا غالبؔ دہلوی مطبوعہ شوکت المطابع میرٹھ ۱۸۹۹ء) میں غالبؔ کو "تحریف و تصرّف" کا نشانہ بنا کر جانے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔؟

شارحینِ غالبؔ میں نواب حیدر یار جنگؔ علامہ نظم طباطبائی کی شرح کو وہی ممتاز مقام حاصل ہے جو خود غالبؔ کو اپنے معاصرین میں حاصل تھا۔ مولانا عبدالرزاق راشد

حیدر آبادی تحریر فرماتے ہیں :-

" شرح طبا طبائی کو درجہ استناد حاصل ہے، جس طرح دیوان غالبؔ بے مثل ہے اسی طرح شرح طبا طبائی (اپنا) جواب نہیں رکھتی۔ دوسری شرحوں کے مقابلے میں شرح طبا طبائی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں فن شعر و سخن کے نکات و رموز اس شرح و لبسط کے ساتھ بیان کئے (گئے) ہیں جس کے مطالعے سے اہلِ ذوق کے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں اور شعر گوئی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

مولانا شبلیؔ نے شرح کو بالاستیعاب دیکھا اور اس شعر کی

قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم

. . . .

شرح پڑھ کر فرمایا کہ :" شرح کس لطف سے بیان کی ہے "!

مولانا حالیؔ ۱۹۰۵ء میں جشنِ جوبلی شاہ دکن میر محبوب علیخاں (میں) شرکت کے لئے حکومت کی دعوت پر آئے تھے۔ مولوی عزیز مرزا صاحب نے مولانا سے کہا۔ کہ نظم طبا طبائیؔ نے غالب پر اعتراض کئے ہیں۔ مولانا (حالیؔ) نے جواب دیا۔ غالبؔ پر حیدر صاحب (نظم طبا طبائی) نے اعتراض نہیں کئے ہیں بلکہ اپنا فرض منصبی ادا کیا ہے شرح کے لئے میں شکریہ ادا کرتا ہوں، استاد مرحوم (یعنی غالبؔ) زندہ ہوتے تو وہ بھی شکریہ ادا کرتے۔!

مولانا حالیؔ علامہ (نظم) سے بڑے تپاک کے ساتھ ملے اور بڑی گرمجوشی سے مصافحہ کیا، مرزا داغ نے شرح کی نفیس

جلد بندھوا کر آئینہ دار الماری میں رکھی، اور کبھی کبھی اس کے
مطالعہ سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں
(زمیندار) شرح کو ہمیشہ پاس رکھتے تھے۔"

(صفحہ ۵۹۔۶۰ اصلاحاتِ غالب)

یہ صحیح ہے کہ شرح طباطبائی جب (غالباً ۱۳۱۱ھ میں) پہلی بار شائع ہوئی تو حیدر آباد کے خاص حلقوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں دلی کے ارباب نظر نے دہلوی اور غیر دہلوی کے زاویۂ نگاہ سے دیکھا اور حیدر آباد والوں نے ملکی اور غیر ملکی نقطۂ نظر سے۔ اور یہ دونوں جس سنگم پر متحد الخیال نظر آئے وہ تھی مولوی عبد العلی والہ حیدرآبادی کی "وثوق صراحت"[ا] جو بلا شبہ اسی عہد کا کارنامہ ہے۔ جب شرح طباطبائی مکمل کی گئی۔ ان دونوں شرحوں سے پہلے غالباً ۱۸۸۷ء میں سید محمد مرتضیٰ بیان یزدانی میرٹھی (وفات ۱۹۰۰ء) نے ماہنامہ "لسان الملک" (میرٹھ) میں "حل المطالب" کے عنوان سے ایک شرح غالب کا سلسلہ شروع کیا تھا جو غالباً مکمل نہ ہو سکا۔

شرح طباطبائی علمی اور فنی اعتبار سے یقیناً ایک مستند۔ معتبر اور جامع شرح کا درجہ رکھتی ہے۔ مگر اس کے باوجود مولانا تمکین کاظمی مرحوم کا یہ خیال بھی درست نہیں ہے۔

"عام طور پر یہ شرح (وثوق صراحت) غالب کی اولین
شرح خیال کیجاتی ہے، مگر مجھے اس کے شرح کہنے میں تامل
ہے، اس کو شرح کہنے کے بجائے غالب کا ایسا دیوان کہا
جاسکتا ہے، جس میں لغات حل کیے گئے ہیں۔ ایران وہندوستان
میں بیشتر عربی وفارسی دواوین اور دوسری کتابیں اسیطرح

[ا] بڑی تقطیع کے ۱۹۲ صفحات پر مشتمل یہ شرح ۱۳۱۲ھ (مطابق ۱۸۹۵ء) میں مطبع نامی فخر نظامی حیدر آباد دکن میں چھپی تھی نایاب تو نہیں کم یاب ضرور ہے۔ اس کا ایک نسخہ پروفیسر سید مسعود حسن ادیب (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے۔

نادم سیتاپوری

حاشیہ پر "حل لغت" لکھ کر شائع کی جاتی تھیں، یہ بھی اسی قبیل کی چیز ہے۔"

(ہم قلم کراچی بابت فروری ۱۹۶۱ء)

سطور بالا کے آخری جزو میں مولانا تمکین کاظمی نے اپنی بات کا خود جواب دے لیا۔؟ حقیقت یہ ہے کہ شرح طباطبائی سے پہلے "شرح کاری" کا اسلوب نگارش یہی تھا جسکی تاسی "وثوق صراحت" کے مصنف نے کی۔ لیکن محض اس جرم میں کہ اس نے کسی نئے اندازِ نگارش کا آغاز کیوں نہیں کیا؟ "وثوق صراحت" جیسی عظیم کاوش کو غالب کی شرحوں کے زمرے سے خارج نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک میں نے "وثوق صراحت" نہیں دیکھی تھی، مَیں اس سلسلے میں کوئی رائے قائم نہیں کر سکتا تھا، مگر خوش قسمتی سے اس کا ایک نسخہ پروفیسر سید مسعود حسین صاحب ادیب (لکھنؤ) کے کتب خانے میں مل گیا جس کی سرسری ورق گردانی کے بعد مَیں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ غالب کی یہ شرح قدیم اسلوب شرح کاری کا ایک سیر حاصل کارنامہ ہے۔ علامہ نظم طباطبائی کی شرح بہر قیمت ایک "نئے طرز شرح کاری" سے تعلق رکھتی ہے اور ان کی نکتہ رسی" ژرف نگاہی" اور بصیرت افروزی سلسلہ غالبیات کے وہ امٹ ابتدائی نقوش ہیں جنھیں کبھی بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

نظم طباطبائی کی شرح کا سب سے بڑا آرٹ یہ ہے کہ جب (۱۳۱۱ھ) میں یہ شائع ہوئی اس وقت تک "نسخہ حمیدیہ" نہیں چھپا تھا اور اچھے اچھے ذی علم ارباب نظر کا ذہن "مشکل پسندی" کے اتار چڑھاؤ سے خالی تھا جس کی تعمیر کا کام "نسخہ حمیدیہ" کی اشاعت (۱۹۲۱ء تخمیناً ۱۳۳۶ھ) کے بعد ہوا۔ نظم طباطبائی نے فکر و تعمق کی ان دشوار گزار راہوں کو کس طرح طے کیا، خود ان کی زبانی سماعت فرمائیے،

"یہ نقل ذکر کرنے کے قابل ہے۔ میرے دوستوں میں ایک صاحب دیوان غالب کا "نسخہ حمیدیہ" لئے ہوئے میرے پاس آئے اور اس مطلع کے معنی مجھ سے پوچھے ؎

جنون گرم انتظار و نالہ بیتابی کمند آیا
سویدا تا بلب زنجیر سے دودِ سپند آیا

شعر کے الفاظ سے یہ سب باتیں پیشِ نظر ہوگئیں کہ "سپند" کو سویدائے دل سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لیکن سویدا" تا بلب زنجیر" کیا معنی۔؟ اور پھر" زنجیر سے دودِ سپند آیا" کیا معنی۔؟

اس کے ساتھ ہی یہ خیال پیدا ہوا کہ۔ شاعر یہ بات کہنا چاہتا ہے کہ سویدا لبوں تک آگیا۔ یعنی کلیجہ منہ کو آگیا"" آیا" اگر سویدا کے ساتھ ہے تو پھر دود کے ساتھ اسے تعلق نہ ہونا چاہیئے؟ کچھ کاتب کا تصرف ہے۔ اب سے پچاس ساٹھ برس پیشتر یائے معروف و مجہول کا فرق کتابت میں نہ تھا۔ یقین ہوگیا شاعر نے یوں کہا تھا ؎

سویدا تا بلب زنجیریؔ دودِ سپند آیا

" ی کو اس طرح لکھیئے کہ اس پر" سی " کا شبہ ہو سکے۔

اب شعر کے معنی کھل گئے۔ یعنی " سویدا دودِ سپند" کا "زنجیری" ہو کر لب تک آیا۔ اس میں شاعر نے دودِ سپند کو زنجیر سے تشبیہ دی ہے۔

اب میں نے دعویٰ کے ساتھ یہ کہدیا کہ جس طرح مَیں پڑھتا ہوں یہی صحیح ہے، غرضیکہ بھوپال میں لکھا گیا کہ اصل نسخہ سے مقابلہ کیا جائے۔ اس کا جواب بھوپال کے ناظم تعلیمات کی طرف سے انھیں میرے عنایت فرما کے نام آیا کہ اصل نسخہ (میں)" زنجیری دودِ سپند" ہے۔ (زنجیر سے) کاتب کی غلطی ہے۔ نقل پر نقل یاد آتی ہے میں جب دیوان غالبؔ کی شرح لکھ رہا تھا تو یہ شعر ؎

غنچہ تا شگفتنہا برگ عافیت معلوم

باوجود دل جمعی خواب گل پریشاں ہے

دیکھ کر مجھے فکر ہوئی کہ یہ کوئی کہنے کا طرز نہیں ہے اس میں ضرور

تحریف ہوئی ہے۔ خیال میں یہ بات آگئی کہ مرزا غالب "تا"
کا استعمال اس طرح بھی کرتے ہیں ع
دیدۂ تا دل اسد آئینہ یک پرتو شوق
وہی "تا" یہاں بھی ہے یعنی۔ "غنچۂ تاشگفتنہا"!

میری شرح چھپ کر نکل چکی ہے میں مرزا داغ مرحوم سے بیٹھا ہوا باتیں کر رہا ہوں۔ ایک عنایت فرمایا دش بخیر نواب سائل دہلوی دوسرے کمرے سے اٹھ کر یہیں آبیٹھے۔ وہ شوکت میرٹھی کی شرح[1] میں شاید یہ فقرہ دیکھ چکے تھے۔ غنچہ کیا ہے "تاشگفتنہا" ہے۔ داغ مرحوم کے سامنے حضرت سائل نے اس شعر کو یوں ہی پڑھا ؎
غنچۂ تاشگفتنہا ......

مرزا داغ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر سر اُٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے کہ دیکھوں اس نے (ابھی) تو شرح لکھی ہے۔ یہ کیا کہتا ہے؟ میں نے شعر کو صحیح کر کے پڑھ دیا اس پر جناب سائل نے مجھ سے پوچھا ہی تھا کہ۔ "ناشگفتنہا" کے کیا معنی۔؟ کہ مرزا داغ مرحوم بول اُٹھے کہ۔ "تاشگفتنہا" "پڑھو۔" (علی حیدر طباطبائی)

---

[1] مولانا احمد حسین شوکت میرٹھی جو اپنے آپکو "مجدد السنہ شرقیہ" کہتے تھے پچھلی صدی کی ایک دلچسپ شخصیت تھے۔ شرح طباطبائی کے بعد انھوں نے "حل کلیات اُردو مرزا غالب دہلوی" (مطبوعہ شوکت المطابع میرٹھ ۱۸۹۹ء) لکھ کر غالب کے کلام میں ایسی ایسی تحریفات کی ہیں کہ کلام غالب قطعاً بے معنی ہو کر رہ گیا ہے غنچہ "تاشگفتنہا" کی شرح خود غالب نے عود ہندی میں کی ہے۔ لیکن مولانا شوکت نے ایک نقطہ صاف کر کے "ناشگفتنہا" بنا دیا۔ تحریر فرماتے ہیں "یعنی نہ کھلنے کا نام ہی غنچہ ہے پس سامانِ آسائش کجا.....!" (حل کلیات اُردو) نادم سیتاپوری

(صفحہ ۲ - اودھ پنچ لکھنؤ - ۱۹ ر اگست ۱۹۲۵ء
جلد ۳ شمارہ ۳۱)

جس طرح غالبؔ اردو کا وہ منفرد شاعر تھا جس کے کلام کی اب تک درجنوں شرحیں لکھی جا چکی ہیں، اسی طرح علامہ نظم طباطبائی اُردو زبان کا پہلا "شارح" ہے جس نے اردو ادبیات کو شرح نگاری کا ایک صحت مند تنقیدی شعور بخشا ہے۔ حالیؔ نے مشرقی تنقید کو جن متوازن راہوں سے روشناس کرایا تھا۔ "یادگار غالبؔ" شاید اس سلسلے کا پہلا تجربہ تھی جس میں غالبؔ کے کلام کی شرح کاری کا عنصر بھی موجود ہے۔ یہی وجہ تھی خود حالیؔ پر بھی ان کی زندگی میں یہی الزام لگایا گیا تھا کہ انھوں نے بعض مقامات پر اپنے اُستاد کی کڑی تنقید کرکے ان کے مرتبے کو گھٹانے کی کوشش کی ہے۔ "یادگارِ غالبؔ" اور شرح طباطبائی کی تصنیف کا زمانہ تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ایک ہی زمانہ ہے، شاید چند سال کا فرق ہو۔ پھر وہ اپنا دامن اِس قسم کے الزامات سے کِس طرح بچا سکتے تھے؟

علامہ نظم طباطبائی کی سب سے بڑی خصوصیت یہی ہے کہ انھوں نے شرح غالبؔ کی تکمیل کے وقت ان کے کلام کو ہر ہر زاویہ سے پرکھنے کی کوشش کی۔ جیسا کہ مندرجہ بالا سطور سے واضح ہے ان کی تعمق نگاہ نے ایک ایک نقطہ کا جائزہ لے کر غالبؔ کو سمجھنے کی کوشِش کی، اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مروّجہ دیوانوں میں ایسے اشعار بھی شامل ہیں، جن پر وقتاً فوقتاً نظر ثانی کرکے خود غالبؔ نے اپنی اصلاحات کے آئینہ میں، انھیں بنایا اور سنوارا ہے۔ غالبیات کے ابتدائی مطالعہ کاروں میں شاید یہ امتیاز طباطبائی کے علاوہ کسی کو بھی حاصِل نہیں ہے کہ انھوں نے کلامِ غالبؔ کو پرکھنے کے لئے ایک ایسا راستہ بھی تلاش کرلیا، جس پر ان سے پہلے کسی دوسرے کی نگاہ نہیں پڑی تھی۔

غالبؔ ہی پر منحصر نہیں؛ جس فنکار نے خود اپنی تخلیقات کا بار بار جائزہ لیا، اس کے آرٹ اور فن کو مختلف اَدوار کی روشنی ملتی ہی رہی، غالبؔ کے مروّجہ دیوان میں متعدد شعر ایسے ملتے ہیں جو اپنی ابتدائی منزل میں کچھ اور تھے۔ اور جب دیوان شائع ہوا تو ان کی ہیئت و شکل بدل گئی۔

غالبؔ کی ایک مشہور غزل ہے۔

گئی وہ بات کہ ہو گفتگو تو کیوں کر ہو
کہے سے کچھ نہ ہوا۔ پھر کہو تو کیوں کر ہو

اسی غزل کا تیسرا شعر ہے۔

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیجئے کیا؟

یہ غزل غالبؔ نے قلعہ معلّیٰ[۵۱] کے مشاعرے میں پڑھی تھی۔ "دہلی اردو اخبار" میں یہ مشاعرہ شائع ہوا تھا۔ ۱۶ رمارچ ۱۸۵۳ء کے شمارے میں غالبؔ کی یہ غزل بھی چھپی ہے، مگر تیسرے شعر کا مصرع اولیٰ اس طرح ہے۔

ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے

بظاہر تقدیم و تاخیر لفظی کی معمولی سی اصلاح ہے لیکن غالبؔ کے یہاں اس "دیکھ ریکھ" کی ایک اہمیت ہے، جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اس مثال کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ شاید کتابت کی غلطی سے الفاظ کا اُلٹ پھیر ہو گیا ہو لیکن "دہلی اخبار" ۱۸ رمارچ ۱۸۵۲ء میں غالبؔ اور ذوقؔ کے مشہور سہرے اس خبر کے ساتھ شائع کئے گئے ہیں۔

"حسب الحکم حضرت سلطانی خلد اللہ ملکہ۔ جو جناب نجم الدولہ اسد اللہ خاں غالبؔ اور جناب خاقانی ہند ملک الشعرا شیخ محمد ابراہیم خاں ذوقؔ نے بہ تقریب شادی مرزا جواں بخت بہادر مُرشد زادہ آفاق کے کچھ اشعار بہ سبیل مبارکبادی سہرا اس ہفتے میں حضور سلطانی میں سرِ دربار گزارنے تھے معہ چند اشعار[۵۲] علاوہ اس کے جو خاص نجم الدولہ

---

۵۱ "قدیم اخبارات کی کچھ جلدیں" از مولانا امتیاز علی خاں عرشی رامپوری مطبوعہ "نوائے ادب" بمبئی بابت ماہ اپریل ۱۹۵۸ء۔

۵۲ غالبؔ کا وہی مشہور معذرت نامہ۔ "منظور ہے۔ گذارش احوال واقعی"

بہادر نے پھر گذرانے واسطے حظ اور کیفیت اپنے ناظرین
اہلِ بصر و بصیرت و ماہرین و واقفین فصاحت و بلاغت
کے "بموجب ترتیب" در پیش ہونے کے ہم درج اخبار
کرتے ہیں۔"

ساتؔ[1] دریا کے فراہم کیے ہوں گے موتی
تب بنا ہوگا اس انداز کا گز بھر سہرا

" دہلی اردو اخبار" کی روایت کے مطابق اس شعر کا مصرعہ اولیٰ دربار میں اس طرح پیش کیا گیا تھا۔

ساتؔ دریا کے کیئے ہوں گے فراہم موتی

سو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

مذکورہ بالا حوالے کے مطابق اس کا مصرعہ ثانی بھی بدلا گیا۔ دربار میں جو قطعہ اعتذار پیش کیا گیا تھا، اس طرح پر تھا

سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
علم و کمال و فضل سے نسبت نہیں مجھے

مروّجہ دیوانوں میں غالبؔ کی مندرجہ ذیل غزل کے اشعار موجود ہیں۔

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن میں

۸ رمئی ۱۸۵۴ء کے "دہلی اُردو اخبار" میں جو مشاعرہ چھپا ہے، اس میں غالبؔ کی یہ غزل بھی شامل ہے، لیکن "دہلی اُردو اخبار" میں اس غزل کے تین اشعار اس طرح پر

---

[1] مروجہ دیوان کے نولکشور ایڈیشن کے علاوہ میں نے "طاہر ایڈیشن" شائع کردہ آغا طاہر دہلوی نبیرہ آزاد دہلوی (۱۹۳۶ء) سے مدد لی ہے جو ایک ایسے نسخہ کی بنیاد پر شائع کیا گیا ہے، جس پر غالبؔ کی مہر ہے۔
(نادم سیتاپوری)

شائع کئے گئے ہیں۔

قفس میں ہوں اگر اچھا نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے نوا سنجانِ گلشن میں

خوشی کیا۔ کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے
سمجھتا ہوں کہ تاکے ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

سخن کیا۔ کہہ نہیں سکتے کہ جویا ہوں جواہر کے
جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ جاکے کھودیں معدن کو

بعد میں غالب نے جب نظر ثانی کی تو مطلع کے مصرعہ اولیٰ میں اصلاح کر دی۔

قفس میں ہوں گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو

اور مندرجہ بالا اشعار کے دوسرے مصرعوں کو اس طرح پر بدل دیا، جو مروجہ دیوانوں میں مستعمل ہے۔

سمجھتا ہوں کہ "ڈھونڈھے" ہے ابھی سے برقِ خرمن کو

جگر کیا ہم نہیں رکھتے کہ کھودیں جا کے معدن کو

اصلاحاتِ لفظی کی ان تاریخی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شرح نگار کی نظر میں فنکار کا ارتقائی مدّوجزر رہنا بہت ہی ضروری ہے، اور اس پس منظر کے بغیر وہ شرح کاری کے اصولی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

شرح طباطبائی جس زمانے میں لکھی گئی اس وقت تک "نسخہ حمیدیہ" نہیں چھپا تھا۔ اس لئے شرح طباطبائی کی اساس و بنیاد یہی مروجہ دیوان ہے جس کا انتخاب مولانا فضل حق خیر آبادی اور مرزا خانی خان نے کیا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب پہلی بار "نسخہ حمیدیہ" شائع ہوا تو مروجہ دیوان کی بہت سی غزلیں بھی اسمیں شامل کر لی گئیں لیکن اسمیں کچھ اشعار ایسے بھی تھے جنہیں "نقش اول" کا درجہ حاصل تھا کیوں کہ ۱۸۲۱ء میں جب یہ

دیوان ترتیب دیا گیا تھا، اس وقت غالب کی عمر پچیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پھر مختلف ادوار میں جب انھوں نے اپنے ابتدائی کلام کا جائزہ لیا تو فن کی پختگی نے کچھ اور نئے زاویے پیدا کر دئے۔ "اصلاحات غالب" علامہ نظم طباطبائی کی ایک ایسی گمنام تصنیف ہے جو اپنے زمانہ تصنیف کے تخمیناً چالیس سال بعد پہلی بار شائع ہوئی ہے، اور وہ بھی اس "المیہ" کے ساتھ کہ چند گنے چنے نسخوں[۵] کے علاوہ اب شاید

---

۵ مولانا عبدالرزاق راشد نے وفات (۱۵ دسمبر ۱۹۶۷ء) سے صرف تین ہفتے قبل جو آخری خط مجھے سیتاپور کے پتے پر لکھا تھا، اس کا ضروری حصہ درج ذیل ہے۔

"گوناگوں پریشانیوں کے باوجود میں نے ایک کتاب "اصلاحات غالب" کے نام سے مرتب کر دی، اور پروفیسر سید محمد صاحب کو ان کے ذاتی مطبع میں چھپنے کو دی۔ کتاب اس قدر غلط چھپی ہے کہ ضائع کر دینا چاہتا تھا، مگر قصہ یہ ہوا کہ کتاب کی پانچ سو کاپیاں سید صاحب نے کسی جلد ساز کو دی تھیں۔ اس جلد ساز کی دوکان پر کرایہ ادا نہ کرنے کے سبب عدالت کی ڈگری آئی اور عدالت کے کارکنوں نے کتاب "اصلاحات غالب" کے تمام نسخے ضبط (قرق) کر لئے۔ خدا جانے یہ پھر ملیں گے بھی یا نہیں؟ آپ کے حکم کی تعمیل سے قاصر رہا یعنی جن لوگوں کے نام کتب بھیجنے کی تجویز آپ نے کی تھی، اسکے مطابق کسی کو بھی کوئی جلد نہیں بھیج سکا۔ ایک کاپی تھی آپ کی خدمت میں پروفیسر صاحب (سید محمد) نے ارسال کی تھی، جس کی رسید آپ نے دیدی ہے۔ سراسیمگی سے ہٹ کر چند لمحات مل جائیں تو قصد ہے کہ دوبارہ اس کتاب کا مسودہ.... اضافہ کے ساتھ لکھ دوں۔" (مکتوب مولانا راشد حیدرآبادی مورخہ ۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء بنام نادم سیتاپوری)

نوٹ: مولانا راشد کو سہو ہوا۔ "اصلاحات غالب" کی ایک جلد نہیں۔ مجھے انکی ہدایت کے مطابق دو جلدیں بھیجی گئی تھیں جو مجھے جون ۱۹۶۷ء میں موصول ہو گئی تھیں پروفیسر سید محمد حیدرآبادی نے کارڈ مورخہ ۱۶ جون ۱۹۶۷ء میں تحریر فرمایا "موصوف (مولانا عبدالرزاق راشد) کی ہدایت پر "اصلاحات غالب" کے دو نسخے آج میں رجسٹرڈ بک پوسٹ کے ذریعہ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔" (کارڈ بنام نادم سیتاپوری)

اس کی کوئی جلد بھی صحیح سالم باقی نہ رہی ہوگی۔ اور یہ آخری خدمت "غالب و اقبال" کے ایک ایسے مخلص اور پرستار نے انجام دی ہے جو مرتے دم تک غالب اور اقبال کی ہر خدمت کو اپنا دین و ایمان سمجھا کیا۔ کبھی "ناظر عالم" کے روپ میں، کبھی عبدالرزاق راشد حیدرآبادی کے نام سے۔ معیاری اور ٹھوس کام کرنیوالوں میں راشد حیدرآبادی ایک تاریخی شخصیت کے حامل تھے۔ شہرت اور نام و نمود سے بے نیاز ہوکر ایک خاص لگن کے ساتھ تقریباً پچاس سال تک مسلسل اُردو ادب کی خدمت کرتے رہے۔ "نگار" کے ابتدائی فائلوں میں اُردو صحافت پر ان کے متعدد مضامین بکھرے ہوئے ملیں گے۔ اخبارات اور رسائل کا ایک بہت بڑا ذخیرہ انھوں نے فراہم کیا تھا جو پولیس ایکشن کے زمانے میں تباہ ہوگیا، پھر بھی مرنے کے بعد کئی ہزار رسائل اور کتب ترکے میں چھوڑیں جو ان کے ورثا نے غالباً "ادارہ ادبیات اُردو" (حیدرآباد) میں محفوظ کردیں۔ ذاتی پروپیگنڈے اور نام و نمود سے انھیں کوئی لگاؤ نہیں تھا۔ میں نے متعدد بار انھیں لکھا کہ وہ اپنے حالات اور ادبی خدمات کا سرسری تذکرہ قلمبند فرمادیں، مگر وہ ہمیشہ ٹال گئے اور بالآخر اپنے آخری خط مورخہ ۲۲ر نومبر ۱۹۶۷ء میں یہ چند سطریں لکھ کر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئے۔

"میری کوتاہیوں کے باوجود آپ کی عنایتیں میرے شامل حال رہیں، جس کے لئے میں دل سے شکرگزار ہوں اور ہمیشہ آپ کی کرم گستری کا امیدوار رہونگا۔ آپ میرے حالات رقم فرمانا چاہتے ہیں۔ مَیں ہوں کس شمار میں۔؟ اور مَیں نے کیا کارنمایاں انجام دئے ہیں کہ میرے واقعات قلمبند کئے جائیں؟ ایک پریشان حال اور پراگندہ طبع شخص کو گمنامی پسند ہے۔ گمنامی ہی میں رہنے دیجئے۔

آپ کے پچھلے دو چار خطوط پڑھ کر بہت منفعل ہُوا کہ بعض استفسارات کے جواب نہیں دئے۔ اب وہ باتیں پرانی ہوگئی ہیں۔ جن دوستوں اور عزیزوں سے محفلیں تھیں وہ اب خواب و خیال ہوگئی ہیں۔ اپنے ہی شہر میں اجنبی ہوں۔ سر پر وحشت سوار ہے۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ مَیں آپ کو بھول گیا ہوں، لیکن بہ تصرف خسرو"

راشد بہ کمند تو اسیر است،
بیچارہ کجا رود ز کو بیست

مولانا راشدؔ سے شرف ملاقات کا اعزاز کبھی حاصل نہ کر سکا۔ مخلصانہ تعلقات کا آغاز بھی خط و کتابت سے ہوا اور انجام بھی اسی آخری خط (۲۲ نومبر ۱۹۶۷ء) پر۔! جو مرنے سے صرف تین ہفتے قبل انھوں نے لکھا تھا۔ لیکن اس کے باوجود راشدؔ نے تمام عمر اس "رشتۂ اخلاص" کو اس طرح پر نبھایا کہ بڑے سے بڑے خانگی مسئلہ پر مجھے یاد فرماتے تھے اور اکثر میرے مشورے پر عمل کرتے تھے۔ اپنی آخری تالیف (اصلاحاتِ غالبؔ) میں جس محبت کے ساتھ مجھے یاد فرمایا ہے، اس سے ان کا بے پناہ خلوص ظاہر ہے۔ میرا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

نادم سیتاپوری!

مولوی[1] اکرام علی اور فورٹ ولیم" آپ کی مشہور تصنیف ہے جس میں آپ نے دادِ تحقیق دی ہے۔ اس کتاب پر حکومتِ ہند نے ازراہ قدر دانی آپ کو انعام عطا فرمایا ہے۔ غالبؔ کے متعلق آپ نے بہت سے بیش بہا مضامین لکھے ہیں۔" "غالب نام آورم" نامی کتاب مقبول ہوئی ہے۔" الحاق کلام غالبؔ" بھی شائع کی ہے جو میری نظر سے نہیں گزری۔ آپ کی غالبؔ سے متعلق تصنیفات نے "غالبیات" میں گراں بہا اضافہ کیا ہے۔ بیسیوں اخبارات و رسائل کی آپ نے ادارت کی ہے اور اپنے رشحات قلم سے اہلِ ذوق کو سیراب کرتے رہتے ہیں۔۔۔!"

(صفحہ ۷۷۔ اصلاحاتِ غالبؔ)

مولانا راشد کے حالاتِ زندگی پر گمنامی کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ مولانا عبدالحق

---

[1] "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" اور "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" ادارہ فروغ اردو لکھنؤ نے شائع کی تھیں، اب تقریباً کمیاب ہیں۔ "غالبؔ کے کلام میں الحاقی عناصر کا دوسرا ایڈیشن مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی نے شائع کیا ہے۔

(بابائے اُردو) ڈاکٹر محی الدین زور قادری تمکین کاظمی اور نصیر الدین ہاشمی وغیرہ کے معاصرین میں تھے۔ مگر گروہ بندیوں سے بہت دُور۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے ادبی تذکرے ان کے ذکر سے یکسر خالی نظر آتے ہیں۔ گذشتہ چالیس پچاس سال تک وہ غالبؔ اور اقبالؔ پر ایک لگن کے ساتھ کام کرتے رہے اور سچ پوچھیے تو جنوبی ہندوستان میں ڈاکٹر اقبالؔ کو راشدؔ ہی نے صحیح معنوں میں روشناس کرایا۔ ان کا مرتب کیا ہُوا "کلیاتِ اقبالؔ" ڈاکٹر اقبالؔ کا وہ پہلا مجموعۂ کلام ہے جو حیدرآباد دکن میں چھپا تھا۔ اس سے قبل اقبالؔ کے جو مجموعے شائع ہوئے تھے وہ سستے ایڈیشن تھے۔

علامہ نظم طباطبائی کے صاحبزادے مولوی سید امجد (سابق لکچرار سائنس جاگیردار حیدرآباد دکن) نے اصلاحاتِ غالبؔ" کے پیش لفظ میں راشدؔ کی ادبی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> "مولوی" مولانا عبدالرزاق صاحب راشدؔ وظیفہ یاب (پنشنر) سینئر ڈپٹی کنٹرولر جنرل اکونٹس و آڈٹ ریاست حیدرآباد دکن کا شمار میرے والد مرحوم (نظم طباطبائی) کے خاص اور ممتاز تلامذہ میں ہے۔ ایک بڑے سرکاری عہدے کے فرائض انجام دیتے ہوئے آپ نے علمی و ادبی مشغلے کے لئے وقت نکالا۔ تیس چالیس سال پہلے اُردو ادب کے بہت سے بنیادی کام انجام دیئے ڈاکٹر اقبال کی اجازت سے ان کا مجموعۂ کلام "کلیاتِ اقبالؔ" کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب نہ صرف ہندوستان کے علمی حلقوں میں مقبول ہوئی بلکہ انگلستان میں بھی اُردو دان انگریزوں نے بڑے شوق کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج

انقلاب ۱۹۴۷ء سے پہلے جس طرح دِلّی کا عوامی تخاطب۔ اجی حضت (اجی حضرت) اور "امان" تھا اسی طرح پنجاب کا "بادشاہو" لکھنؤ کا نواب صاحب، بمبئی کا سیٹھ۔ بھوپال کا "ارخان" اور حیدرآباد کا "مولوی صاحب"۔ بلا امتیاز مذہب و ملت ہر شخص کو "مولوی صاحب" کہکر خطاب کیا جاتا تھا اور یہ وہاں کی مشترکہ تہذیب کا ایک خاص عوامی اندازِ تخاطب تھا۔ جو اب پولیس ایکشن کے بعد سمٹ سمٹا کر خواص تک محدود ہو گیا ہے۔ (نادم سیتاپوری)

یونیورسٹی نے اس کی بڑی تعریف کی۔ اب یہ کتاب کمیاب ہے۔
ایک کتابچہ "انتخابِ غالبؔ" کے نام سے آپ نے سب سے پہلے
"۲۵؍۳۵ء" میں شائع کیا۔ ایک دوسرا رسالہ بھی "اکبرؔ و اقبالؔ
کی پیشین گوئیاں" کے عنوان سے چھپوایا۔ چار جلدوں میں تاریخ
اُردو صحافت لکھنا چاہتے تھے مگر کچھ ایسی الجھنوں میں مبتلا رہے
کہ یہ مقصد پورا نہ ہو سکا (۱۰؍دسمبر ۱۹۶۵ء)

"اصلاحاتِ غالبؔ" علّامہ نظم طباطبائی کی آخری تصنیف ہے، جسے مولانا عبدالرزاق راشدؔ مرحوم نے علامہ کی وفات (۵؍مئی ۱۹۳۳ء) کے بعد پہلی بار ترتیب دیکر ۱۹۶۶ء میں "اعجاز پرنٹنگ پریس" (چھتہ بازار) حیدرآباد دکن سے شائع کیا گیا یہ چھوٹا سا رسالہ جس کی کتابی ضخامت ساٹھ صفحات سے زائد نہیں ہے۔ علّامہ طباطبائی نے "نسخۂ حمیدیہ" کی اشاعت (۱۹۲۱ء) کے بعد تحریر فرمایا تھا۔ مولانا راشدؔ نے اپنے طویل دیباچے میں اس کی تفصیلات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"فرمانروائے بھوپال پرنس حمیداللہ خاں مرحوم و مغفور علی گڑھ کالج میں میرے ہم جماعت تھے۔ آپ کی شاہی حوصلہ مندیوں کی بدولت جب دیوانِ غالبؔ (نسخۂ حمیدیہ) بھوپال سے شائع ہوا تو آپ کے ارشاد کی بنا پر مفتی انوارالحق مرحوم مرتب نسخۂ حمیدیہ نے دیوان کی دو جلدیں میرے پاس بھیجیں۔ ایک جلد میں نے اپنے مطالعہ میں رکھی اور دوسری استاذی علاّ سید علی حیدر نظم طباطبائی المخاطب بہ حیدر یار جنگ کے ملاحظ میں پیش کر کے فرمائش کی کہ مرزا غالبؔ کا جو نیا کلام دستیاب ہوا ہے اس کی شرح لکھ دی جائے تاکہ متداول دیوان کی شرح طباطبائی مکمل ہو جائے۔ دیوان کا مطالعہ کر کے دو ہفتوں کے بعد علامہ غریب خانے پر تشریف لائے اور فرمایا کہ میری

شرح کے باعث غالب پر سے مہمل گوئی کا الزام اُٹھ گیا اس کو محض اشعار کی شرح سمجھنا درست نہیں ہے کیونکہ اس میں فن و شعر کے رموز و نکات آ گئے ہیں، اور غالب پر بہ اعتبار فن کچھ تنقید بھی ہو گئی ہے۔ لیکن اب پیرانہ سالی کے باعث محنت و مشقت برداشت نہیں ہو سکتی اس لئے نئے کلام کی شرح لکھنے سے متعذر ہوں بہتر ہو گا کہ آپ شرح لکھ دیں میں اس پر ایک نظر ڈال لوں گا۔ یہ سُن کر مجھے بڑی مایوسی ہوئی کیونکہ دیوان غالب کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں۔ ان سب میں علامہ ہی کی شرح مشہور، مقبول اور مستند ہے۔ اس لئے میں نے عرض کیا کہ اگر شرح لکھنے میں معذوری ہو تو کم از کم غالب نے اپنے اشعار میں جو ردو بدل کیا ہے اور دیوان میں سے جو اشعار خارج کر دئے ہیں، اس کے وجوہ قلمبند کئے جائیں۔ میری اس استدعا کو بطیب خاطر منظور کر کے علامہ نے ترمیمات میں اشعار پر تبصرہ کرنے کا وعدہ کیا اور مجھ سے رخصت ہوئے۔

میں سمجھتا تھا کہ اس بہانے سے کسی طرح آہستہ آہستہ نئے کلام کی شرح بھی اعتذار کے باوجود علامہ سے لکھوا لونگا، مگر افسوس کہ نہ لکھوا سکا۔ اس خیال سے کہ مسودہ دیوان کے اندر ہی محفوظ رہے اور علیحدہ کاغذات پر لکھے جانے سے کہ کبر سنی کے باعث کہیں خلط ملط نہ ہو جائے۔ میں نے غزلوں کے درمیان ایک ایک سادہ ورق لگوا کر دیوان کو تبصرہ کیلئے بھیج دیا۔ ایک مہینے کے بعد علامہ نے مجھ کو لکھا کہ "غالب" سے فارغ ہو چکا اسی شخص کے ہاتھ روانہ

کرتا ہوں، مختصر مقدمہ بھی اس پر لکھوں گا۔

یہ تحریر مجھے ملی مگر اس کے ساتھ دیوان نہیں بھیجا۔ دیوان لینے کو جب میں خود علاّمہ کے دولت کدہ کو گیا تو معلوم ہوا کہ شہر میں نہیں ہیں۔ شیوع مرض طاعون کے سبب سے نقل مقام کر کے کسی گاؤں میں مقیم ہیں، چند روز کے بعد ڈاک کے ذریعہ علاّمہ کا یہ عنایت نامہ ملا۔

تسلیمات۔ میں "بال ستّی" کے کھیت میں اپنے ہی مکان میں ہوں "دھارور" چلا گیا تھا۔

وہاں بھی یہ مرض پھیل گیا سب کو لے کر اب یہیں چلا آیا ہوں خداوند کریم ہم کو آپ کو سب کو محفوظ رکھے۔ دیوان کے لئے کسی کو بھیجیے۔

نیاز مند

سید علی حیدر طباطبائی۔ ۱۲ ر رمضان المبارک (سنہ ندارد)

جب شہر مرض طاعون سے پاک وصاف ہو گیا تو میرے ہاں بہ تقریب سالگرہ نورچشمی اختر فاطمہ سلمہا ایک مجلس شعر منعقد ہوئی جس میں شرکت کی دعوت دی جانے پر علاّمہ نے یہ جواب مرحمت فرمایا۔

تسلیم۔ صحبتِ شعر میں ضرور انشاءاللہ آؤں گا۔ "اصلاحاتِ مرزا غالب" پر مقدمہ لکھنے کی مہلت اس زمانے میں نہیں ہوئی۔ مجھے کچھ امتحانات کے پرچے مرتب کرنا تھے۔ اسی میں مشغول رہا۔

بعض اوقات میں نئی مطبوعات ملاحظہ کے لئے بھیجا کرتا تھا، ڈاکٹر اقبال کا مجموعہ کلام اردو بھیجا تو مجھ کو یہ تجویز

ارسال کی۔

تسلیم۔ "بانگِ درا" کا شکریہ۔ غالب کی اصلاحیں ایک رسالہ کی صورت میں ضرور شائع ہونی چاہیے۔ یہ رسالہ آپ نے مجھ سے لکھوالیا ورنہ میری بے پروائی کبھی کوئی کام مجھے نہیں کرنے دیتی۔ میں آپ کا ممنون ہوں۔

راقم نیاز

سید حیدر علی طباطبائی

مجھے اس امر کا بڑا ملال ہے کہ یہ رسالہ علامہ کی حیات میں طبع نہ ہو سکا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں اپنے دفتر کی بے پناہ مصروفیتوں کے باعث وقت نہیں نکال سکا۔ اتنی طویل مدّت کے بعد میں اس کو جناب سید محمدؔ صاحب پروفیسر اردو عثمانیہ یونیورسٹی کی توجہ و عنایت سے طبع کرا کے شائع کر رہا ہوں، اُمید ہے کہ "شرح طباطبائی" کے مانند اس رسالہ کو بھی مقبولیت حاصل ہوگی"۔

(صفحہ ۵۔ ۷۔ اصلاحاتِ غالبؔ)

چالیس سال سے کچھ زائد یہ مسوّدہ مولانا راشدؔ مرحوم نے سینے سے لگائے رکھا۔ ایک آدھ بار اس کی اشاعت کے سلسلے میں مجھے لکھا بھی۔ مَیں نے عرض کیا کہ اسکی اشاعت اس زمانے میں مناسب ہوگی جب غالبؔ کے صد سالہ جشن کی تقریبات منائی جائیں۔ لیکن مسلسل تین چار برس تک ہم دونوں کے سلسلۂ مراسلت پر ایک جمود سا طاری رہا میں نے دو چار خطوط لکھے بھی مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ ۲۰ رجون ۱۹۶۷ء کو اچانک پروفیسر سید محمد کا ایک کارڈ ملا۔

مکرمی۔ سلام مسنون!

مولانا عبدالرزاق صاحب راشدؔ علیل ہیں اُنھوں نے بڑی مشکل سے اس کارڈ پر آپ کا پتہ اپنے قلم سے لکھا ہے ذرا طبیعت سنبھل جائے تو وہ آپ کو خط لکھیں گے۔

موصوف کی ہدایت پر "اصلاحاتِ غالبؔ" کے دو نسخے آج میں رجسٹرڈ بک پوسٹ کے ذریعہ آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں۔"

کتابیں مل گئیں، مَیں نے پروفیسر سید محمد کو بھی رسید بھیج دی اور مولانا راشدؔ کو بھی خط لکھ دیا۔ کئی مہینے کے بعد مولانا کا کارڈ (بلا تاریخ) ۹ رستمبر ۱۹۶۷ء کو موصول ہوا جس میں تحریر تھا۔

برادرِ محترم سلامت۔ تسلیم

۲۳/۸ کا مکتوبِ گرامی اور اس سے قبل دو نوازش نامے موصول ہوئے۔ میں بڑے درد و کرب میں مبتلا ہوں، ہوش و حواس معطل ہیں اس سبب سے آپ کی بارگاہ میں چار برس سے غیر حاضر ہوں، تفصیل آیندہ خط میں دیکھیے گا۔ کتاب "اصلاحاتِ غالبؔ" اس قدر غلط چھپی ہے کہ ضائع کر دینے کو جی چاہتا ہے ... ... کتاب کی غلط طباعت سے طبیعت نہایت مکدّر رہے۔ حضرت طباطبائی کا تبصرہ ترمیمات غالبؔ پر کتاب کی جان ہے باقی میرا نوشتہ خرافات۔! ایک نقاد کی نظر سے دیکھ کر تاثرات لکھ بھیجیے ممنون ہوں گا۔

والسّلام

عبدالرّزاق

(پتہ) برادرِ محترم جناب نادم سیتاپوری۔ کوٹھی میر صاحب
محلہ قضیارہ سیتاپور (لکھنؤ)

جانے کس بری ساعت مولانا راشدؔ نے اس کتاب کے ضائع کر دینے کی نیت کی تھی۔ کتاب ضائع ہوئی اور اس بری طرح کہ شاید اب اس کے چند نسخے بھی صحیح و سالم باقی نہ رہے ہوں گے۔ اور اس کتاب کی اہمیت بدستور وہی ہے جو اشاعت سے پہلے تھی یعنی مطبوعہ ہونے کے بعد بھی اگر اُسے "غیر مطبوعہ" کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

"اصلاحاتِ غالب" بلحاظ ترتیب دو حصّوں پر مشتمل ہے۔ صفحہ ۶۰ تک پیش لفظ، دیباچے کے بعد مولانا راشدؔ کی تحریر کردہ "سوانح طباطبائی" ہے جس میں ان کے حیدر آباد کے زمانہ قیام کے تفصیلی حالات وغیرہ ہیں۔ فہرست مضامین جو "غلط نامے" کے ساتھ علیٰحدہ چھپی ہے، اس میں عنوان کی صراحت اس طرح پر کی گئی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ان عنوانات میں بہت سے "جزئیات" اپنے موضوع سے دور پہنچ گئے ہیں اور بعض مقامات پر تسلسل قائم نہیں رہ سکا ہے، پھر بھی مولانا راشدؔ نے علامہ نظم کی زندگی کو جتنا قریب سے دیکھا ہے، اس کا پورا پورا عکس ان صفحات میں موجود ہے۔ کتاب کا یہ حصّہ یکم دسمبر ۱۹۶۶ء کو مکمل ہوا۔ اور بلاشبہ اس کی تالیف کا دور وہی تھا جب مولانا راشدؔ گوناگوں مصائب و آلام کا شکار تھے۔ ایک تو پیرانہ سالی۔ پھر خانگی حادثات و سانحات اور سب سے زیادہ علالت کا لامتناہی سلسلہ۔ ان حالات میں جس طرح پر اور جو کچھ لکھ ڈالا وہ انھیں کا حصّہ تھا۔ ان اوراق میں اُردو ادب کے بعض ایسے تاریخی شواہد بھی ملیں گے جنھیں دستاویزی اہمیت حاصل ہے۔

"اصلاحات غالبؔ" میں ڈیڑھ سو سے زائد ایسے اشعار کا تجزیہ کیا گیا ہے جن پر خود غالبؔ نے مختلف پہلوؤں سے نظر ثانی کر کے "اصلاح" دی ہے۔ علامہ نظم نے نہ محض ان تمام اصلاحات کو یکجا کر دیا ہے بلکہ تنقیدی نقطۂ نظر سے ان اصلاحات کا جائزہ لے کر یہ بھی بتایا ہے کہ آخری اصلاح کے بعد شعر کی فنکارانہ عظمت میں کس طرح پر اضافہ ہوا ہے؟ "شارحین" کی تاریخ میں علامہ طباطبائی کے علاوہ شاید کوئی دوسری شخصیت نہ ملے گی جس نے بحیثیت شارح اس اہم ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کی ہو۔ اور بحیثیتِ شارح اس بار کو بھی اپنے سر لے لیا ہو کہ شاعر نے اپنی فنی زندگی کے مختلف ادوار میں اپنے فن کو کن زاویوں سے پرکھا تھا۔ طباطبائی کی شرح اگرچہ "نسخۂ حمیدیہ" کی شرح نہیں تھی، لیکن مروجہ دیوان کا کچھ حصّہ "نسخۂ حمیدیہ" کے اوراق میں بھی بکھرا ہوا مل گیا۔ وجاہت علی سندیلوی نے "باقیات غالبؔ" میں تحریر فرمایا ہے۔

غالباً بہت سے لوگوں کو یہ بات بڑی حیرت انگیز
معلوم ہو گی کہ ان معرکۃ الآرا غزلوں میں سے کہ جن پر
متداول دیوانِ غالبؔ کی موجودہ قدر و منزلت کی اساس

قائم ہے ۔ ایک تہائی کے قریب غالبؔ چوبیس سال کی عمر سے قبل ہی کہہ چکے تھے ۔ مثال کے طور پر صرف چند غزلیں ملاحظہ فرمائیے جو نسخۂ حمیدیہ میں بھی بہت معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ موجود ہیں ۔"

۱۔ نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
۲۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
۳۔ وہ مری چینِ جبیں سے غمِ پنہاں سمجھا
۴۔ دہر میں نقشِ وفا وجہ تسلّی نہ ہوا
۵۔ پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
۶۔ نہ گل نغمہ ہوں نہ پردہ ساز
۷۔ آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک
۸۔ وہ فراق اور وہ وصال کہاں
۹۔ غنچہ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
۱۰۔ ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
۱۱۔ جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
۱۲۔ درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے
۱۳۔ آ کہ میری جان کو قرار نہیں
۱۴۔ نہوئی گر مرے مرنے سے تسلّی نہوئی
۱۵۔ جب تک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
۱۶۔ آئینہ کیوں نہ دوں کہ تماشا کہیں جسے
۱۷۔ شبنم بہ گل ولالہ نہ خالی زادا ہے ۔

(وغیرہ وغیرہ)

(صفحہ ۱۳۱۔ باقیاتِ غالبؔ مطبوعہ شاہی پریس لکھنؤ دسمبر ۱۹۶۰ء)

ذوالفقار

نسخۂ حمیدیہ میں ایسے "نقوشِ اول" کا انکشاف غالبؔ کے ابتدائی شرح نگاروں کے لئے اہم "لمحہ فکریہ" کا درجہ رکھتا ہے جس کا احساس علامہ طباطبائی ہی کو سب سے پہلے ہوا جو اصلاحاتِ غالبؔ کی شکل میں آج موجود ہے۔

غالبؔ کی ان اصلاحات کو بالتفصیل پیش کرنے کا تو موقع نہیں ہے، لیکن ذیل میں کچھ ایسی مثالیں پیش کر دینا ضروری ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ طباطبائی کی ناقدانہ ژرف نگاہی نے غالبؔ کے فن اور آرٹ کو کافی تعمقِ علمی سے پرکھنے کی کوشش کی۔ اور "غالبیات" کے سلسلے میں ان کی یہ کوشش ایک ناقابلِ فراموش کارنامہ ہے۔

بسکہ ہوں غالبؔ اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موئے آتش دیدہ ہے "حلقہ مری" زنجیر کا

غالبؔ نے اس شعر کے دونوں مصرعوں میں اصلاح کر کے اسے مقطع میں تبدیل کر دیا۔ پہلے یہ شعر تھا اور اس طرح پر۔

آتشیں پا ہوں گدازِ وحشتِ زنداں نہ پوچھ
موئے آتش دیدہ ہے "ہر حلقہ یاں" زنجیر کا

بوئے گل۔ نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

اس کا مصرعہ اولیٰ پہلے یہ تھا۔ جسے بدل کر "بوئے گل۔ نالۂ دل ... الخ۔؟ بنایا گیا۔

عشرتِ ایجاد۔ چہ بوئے وگل وکو دودِ چراغ [۱]

تھی نو آموز فنا۔ ہمتّ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

---

[۱] یہ مصرعہ اصلاحاتِ غالبؔ میں اسی طرح چھپا ہے۔

اس شعر کے پہلے مصرعہ میں "ہمتِ دشوارئ شوق" کا ٹکڑا بدل کر "ہمّت دشوار پسند" کی اصلاح کی گئی۔

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ
ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہوا

ابتداً اس مقطع کا مصرعہ اولیٰ تھا۔

مر گیا صدمۂ آواز سے قُم کی غالبؔ

نظر ثانی میں "صدمہ یک جنبشِ لب" بدل دیا گیا۔

قاصد کی اپنے ہاتھ سے گردن نہ ماریئے
اس کی خطا نہیں ہے، یہ میرا قصور تھا

اس کے دوسرے مصرعہ میں اصلاح کی گئی، پہلی فکر میں مصرعہ ثانی اس طرح پر تھا

ہاں اس معاملے میں تو میرا قصور تھا

لے تو لوں سوتے میں اس کے پاؤں کا بوسہ مگر
ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائے گا

پہلے اس شعر کا مصرعہ اولیٰ یہ تھا۔

لے تو لوں سوتے میں اس کے بوسہ ہائے پا مگر

آہ وہ جرأتِ فریاد کہاں!
دل سے تنگ آکے جگر یاد آیا!

اس شعر کے دوسرے مصرعہ میں ابتداً۔ (دل کے پردے میں جگر یاد آیا)، کی تخئیل تھی بعد میں "دل سے تنگ آکے" بنایا گیا۔

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا

غالبؔ نے اس مطلع کے دوسرے مصرعہ (جس دل پہ ناز تھا مجھے وہ دل نہیں رہا) پر تین مصرعہ لگائے۔ ایک تو یہی۔ (عرضِ نیاز...) اور دو مصرعے یہ تھے، جنھیں بعد میں قلمزد کر دیا۔

بیدادِ عشق سے نہیں ڈرتا اسدؔ اگر
اندازِ نالہ یاد ہیں سب مجھ کو پر اسدؔ

لیکن۔ آخر کار اسے مطلع ہی کی شکل دی۔ اور یہی مروجہ دیوان میں موجود ہے۔

اسدؔ بسمل ہے کس انداز کا قاتل سے کہتا ہے
تو مشقِ ناز کر "خونِ دو عالم" میری گردن پر

اس مقطع کے دوسرے مصرعہ میں ابتداءً "خونِ تمنا" تھا جسے بدل کر "خونِ دو عالم" بنایا گیا۔

نگہ التفاتِ سوئے اسدؔ
مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا

پہلے اس کا مصرعہ اولیٰ تھا۔

یا علیؓ اک نگاہ سوئے اسدؔ

بعد میں یہ مصرعہ بدل دیا گیا ہے۔ طباطبائی نے لکھا ہے۔

"یا علیؓ.. .. الخ! یہ ایک معمولی سا شعر تھا۔ ان مضامین کو اکثر لوگ کہا کرتے ہیں، اس کے سوا کوئی سقم نہ تھا۔

مصنف (غالبؔ) نے نظرِ ثانی میں مصرعہ اس طرح بدل دیا۔" (نگہ التفات سوئے اسدؔ
جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی

گفتۂ غالبؔ ایکبار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

اس کا دوسرا مصرعہ بدلا گیا۔ پہلے اس طرح پر تھا۔

شعر اسدؔ کے ایک دو پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخؔ

آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

غالبؔ کا مشہور مقطع ہے۔ لیکن شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہو کہ اس کا پہلا مصرعہ ابتداء میں یہ تھا۔

ریختہ کا وہ ظہوری ہے بقولِ ناسخؔ

ناسخؔ کا مقطع ہے۔

شبہ ناسخؔ نہیں کچھ میرؔ کی استادی میں

آپ بے بہرہ "ہیں" جو معتقدِ میرؔ نہیں

غالبؔ نے اس کے مصرعہ ثانی میں بھی تصرف کیا ہے اور "آپ بے بہرہ ہیں" کے بجائے (آپ بے بہرہ ہے) لکھا ہے۔

کہتا تھا کل وہ نامہ رساں سے بسوزِ دل

دردِ جدائی اسد اللہ خاں نہ پوچھ

اس کا پہلا مصرعہ بعد میں بدلا گیا۔ نظرِ ثانی سے پہلا یہ تھا۔

کہتا تھا کل وہ محرمِ راز اپنے سے کہ ہاں

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

اس مقطع کا نقشِ اوّل "کچھ اور تھا۔ نظرِ ثانی کے وقت پوری تخئیل ہی بدل دی۔

پہلا مقطع ملاحظہ ہو۔

پہلو تہی نہ کر غم و اندوہ سے اسدؔ
دل وقفِ درد کر۔ کہ فقیروں کا مال ہے

بیکسی ہائے شب ہجر کی "حسرت ہے ہے"
سایۂ خورشید قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

اس کے پہلے مصرعہ میں بھی اصلاح کی گئی۔ شروع میں یہ مصرعہ تھا۔

بیکسی ہائے شبِ ہجر کی "وحشت مت پوچھ"

"شرح طباطبائی" کی اشاعت کے بعد علامہ نظمؔ کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ انھوں نے شرح کے پردے میں غالبؔ پر اعتراضات کئے ہیں۔ نظمؔ نے کبھی اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ "شرح نگاری" کے جس نئے اسلوب سے انھوں نے روشناس کرایا تھا، ان بدلی ہوئی قدروں نے رفتہ رفتہ خود ان الزامات کی تردید کردی۔ اور جوں جوں غالبؔ کی فکروفن سے وابستگی بڑھتی گئی، غالب پسندوں کے علمی حلقوں میں طباطبائی کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔

"اصلاحات غالبؔ" اس سلسلے کی آخری کڑی ہے، جس میں نہ صرف نظمؔ نے غالبؔ کی اصلاحات و ترمیمات کی شارحانہ علمی وضاحت فرمائی ہے بلکہ غالبؔ کو تنقید کے ان غلط زاویوں سے بچانے کی بھی کوشش کی ہے، جو روز بروز شدت اختیار کرتے چلے جا رہے ہیں،۔

غالبؔ کے خطوط افرادِ خاندان کے نام

غالبؔ کے خطوط افرادِ خاندان کے نام

غالبؔ نے قدر بلگرامی کو ایک خط میں لکھا ہے:۔

"سید صاحب تم نے جو خط میں برخوردار کامگار مرزا عباس بیگ خان بہادر کی رعایت اور عنایت کا شکریہ ادا کیا ہے تم کیونکر شکر گذار ہوتے ہو۔ جو کچھ نیکی اور نکوئی اس اقبال نشان نے تمہارے ساتھ کی ہے وہ بعینہٖ میرے ساتھ کی ہے اس کا سپاس میں ادا کروں۔

خدا قسم دل سے دعائیں دے رہا ہوں بھائی! اس کا جوہر طبع از روئے فطرت شریف ہے پروردگار اس کو سلامت رکھے اور مدارج اعلیٰ کو پہنچا دے۔ یہ اپنے خاندان کا فخر ہے اور چونکہ اس کی "ماں" کا اور میرا لہو اور گوشت اور ہڈی اور قوم اور ذات ایک ہے، پس وہ فخر میری طرف سے بھی عائد ہوتا ہے وہ اپنے جی میں کہتا ہو گا کہ ماموں (غالبؔ) میری بیٹی کے بیاہ میں نہ آیا اور "صرف زر" سے جی چرایا ہے میں تو زر کو خاک دخاکستر کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ مگر میں کیا کروں کہ مجھ میں دم ہی نہ تھا کاش کہ جب

ایسا ہوتا جیسا اب ہوں تو سب سے پہلے پہنچتا۔ جی اس کے دیکھنے کو بہت چاہتا ہے دیکھوں اس کا دیکھنا کب میسر آتا ہے۔ مَیں اب اچھا ہوں برس دن صاحبِ فراش رہا ہوں چھوٹے بڑے زخم بارہ اور سر زخم خونچکاں۔ ایک درجن بھالے لگ جاتے تھے جسم میں جتنا لہو تھا پیپ ہو کر نکل گیا تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے وہ کھا کر جیتا ہوں۔ کبھی کھاتا ہوں کبھی پیتا ہوں۔ مرض کے آثار میں اب بھی یہ نشان موجود ہے کہ دونوں پاؤں کی دو انگلیاں ٹیڑھی ہوگئیں ہیں معہٰذا متورم ہیں۔ جوتا نہیں پہنا جاتا۔ ضعف کا تو بیان ہو ہی نہیں سکتا مگر۔ ہاں یہ میرا شعر؎

در کشاکش ضعفم نہ گسلد رواں از تن
ایں کہ من نمی میرم ہم زناتوانی ہاست

اب کے رجب یعنی ماہ آیندہ کی آٹھویں تاریخ سے ستّرواں برس شروع ہوگا۔ چو ہفتاد آمد اعضا رفت از کار۔ اس لئے اب شکوۂ ضعف نادانی ہے ایمان سلامت رہے۔ نجات کا طالب۔ غالبؔ،

سہ شنبہ ۲۴ نومبر ۱۸۶۳ء

(صفحہ ۱۹۲-۱۹۳- ادبی خطوط غالب (طبع ہفتم) ایجوکیشنل پریس۔ کراچی ۱۹۶۴ء)

ایک دوسرے خط میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"صاحب تم سے پہلے یہ پوچھا جاتا ہے کہ جب تم جانتے ہو کہ "مرزا عباس" میری حقیقی بہن کا بیٹا ہے تو پھر مَیں مرزا (عباس بیگ) کی اولاد کا نانا کیوں کر بنا؟ مرزا

(عباس بیگ) کی بیوی میری بہو - بیٹی نہیں ہے۔
تم نے جو لکھا ہے کہ میرے نواسے کی شادی ہے۔ کیا
سمجھ کر لکھا ہے؟ مَیں مرزا عباس بیگ کی اولاد کا نانا
کیونکر بنا۔! بھانجے کی اولاد پوتا پوتی ہے نہ کہ نواسہ
نواسی۔"

(صفحہ ۲۸۲ و ۲۸۳ - ادبی خطوط غالبؔ -)

یہ مرزا عباس بیگ خان بہادر وہی ہیں جن کا ذکر "احوالِ غالبؔ" مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین آرزو (صفحہ ۱۹۵) میں "غالبؔ کے چند اعزہ" کے تحت کیا گیا ہے اور غالب کے ان "باقیات الصالحات کو غالبؔ کے سسرالی رشتہ داروں میں شامل کر کے ان کی تاریخی اہمیت کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے حالانکہ غالب کے پس ماندگان میں ان کے سوا کوئی نہیں ہے۔

غالبؔ اپنی سات اولادوں کو 'آغوشِ لحد' میں سُلانے کے بعد بالکل یک و تنہا رہ گئے تھے اس دنیا میں۔! بیوی کے علاوہ ان کے ہم نسب اعزہ میں ان کی حقیقی بھتیجی عزیز النساء بیگم (دختر مرزا محمد یوسف بیگ) کے بعد صرف ان کی حقیقی بہن "چھوٹی خانم" کی اولاد ہی ہے جسے ان کے باقیات الصالحات کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ قدر بلگرامی کے نام ان دونوں خطوط سے ظاہر ہے کہ غالبؔ کی نظر میں ان رشتوں کی کتنی اہمیت تھی اور ہوتی بھی کیوں نہیں؟ حقیقی بہن اور وہ بھی اکلوتی بہن کی اولاد!

مرزا اکبر بیگ بدخشی (غالبؔ کے بہنوئی) دلّی کے عمائدین میں تھے جن کا سلسلۂ نسب دادا سبز پوش تک پہنچتا تھا۔ شاہانِ دہلی سے بھی قرابتیں تھیں۔ اکبر بیگ بدخشی کے ایک بھائی جواد الدولہ مرزا افضل بیگ اور ایک بہن خواجہ امان مترجم بوستان خیال" کی" والدہ تھیں۔ جواد الدولہ کی نسل سے چوتھی پشت میں مرزا فرحت اللہ بیگ اور مرزا عصمت اللہ بیگ تھے!

غالب کی بہن چھوٹی خانم جنھیں مرزا پیار میں "بوا" کہتے تھے انکا شجرہ درج ذیل ہے:

مرزا اکبر بیگ بدخشی
شوہر چھوٹی خانم

- مرزا عاشور بیگ
  - احمد بیگ
  - خداداد بیگ
  - رفیع الدین بیگ
  - محمود بیگ
- مرزا عباس بیگ خان بہادر
  - وجیہہ النساء زوجۂ محمود بیگ
- مرزا جواد بیگ عرف مرزا مغل بیگ
  - آغا مرزا بیگ سرور جنگ وفات سنہ ۱۹۳ء
  - مرزا فیاض بیگ
    - مرزا فیض حسین بیگ
      - مرزا وقار علی بیگ
      - مرزا اقبال علی بیگ
      - مرزا ذوالفقار علی بیگ
      - مرزا محبوب حسین بیگ
      - مرزا حسین بیگ
  - مرزا ساجد بیگ
  - مرزا واحد بیگ
- امانی خانم زوجۂ نواب علی بخش خاں لوہارو
  - مرزا محمد سعید خاں وفات سنہ ۱۹۶۸ء
  - نواب غلام فخر الدین خاں
    - سکندر زمانی بیگم زوجۂ سرور جنگ

مرزا عاشور بیگ انقلاب سن ستاون میں "کانے مٹکاف" سے لڑ کر شہید ہوئے۔ اور اس سانحے کے بعد ہی اِن کی اولاد اور مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) کے تمام عیال و اطفال الور ہوتے ہوئے ڈپٹی عباس بیگ (خان بہادر) کے پاس سیتاپور آ گئے۔ مرزا جواد بیگ سیتاپور کے افسر اسلحہ ہو گئے اور اس خاندان کے تمام بچوں کی ابتدائی تعلیم ڈپٹی عباس بیگ کی سرپرستی میں سیتاپور ہی میں ہوئی۔

غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے اور ہنگامۂ سن ستاون سے پہلے علاقہ ملّان پور (ضلع سیتاپور) کی سرکشی و بغاوت پر قابو پانے کے لئے مامور کئے گئے تھے۔ اسی سلسلے میں انھیں ضلع سیتاپور میں ایک تعلقہ "بڑا گاؤں" انگریزوں نے دیدیا تھا اور یہ مستقلاً یہاں رہ بس گئے۔ کچھ دنوں ہردوئی میں اکسٹرا اسسٹنٹ بھی رہے اور ڈپٹی عباس کے نام سے شہرت پائی۔ سیتاپور میں ابتداءً انھیں وہ عمارت بود و باش کے لئے دی گئی تھی جس میں اب زنانہ اسپتال ہے، بعد میں ریلوے اسٹیشن چھوٹی لائن کے قریب راجہ کپور تھلہ کی کوٹھی خریدی گئی اور ۱۹۰۲ء میں یہ خاندان وہاں منتقل ہو گیا۔ ڈپٹی عباس بیگ کی ایک کوٹھی لکھنؤ میں اس مقام پر تھی جہاں پر اب کوتوالی قیصر باغ قائم کی گئی ہے۔ کوتوالی کے حدود میں جانبِ جنوب ڈپٹی عباس بیگ کا امام باڑہ آج بھی موجود ہے جس کے ایک حصہ میں ان کی اور ان کی بیوی کی قبریں بنی ہوئی ہیں حدود کوتوالی کے باہر پورب کی طرف اس عمارت کا ایک چھوٹا سا حصہ اب بھی "عباس منزل" کے نام سے موسوم ہے۔ جس میں اسی خاندان کے کچھ افراد سکونت گزیں ہیں:۔

ڈپٹی عباس بیگ بڑی سوجھ بوجھ کے رئیس تھے۔ اس عہد کی تعلیمی سرگرمیوں سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ کیننگ کالج (موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی) کے قیام میں ان کا خاص ہاتھ رہا ہے۔ آدمی کچھ زیادہ پڑھے لکھے تو نہیں تھے، مگر ان کی زندگی ادبی و علمی دلچسپیوں سے یکسر خالی بھی نہیں تھی۔ سید غلام حسنین قدر بلگرامی (تلمیذ غالب) ان کی زندگی بھر درباری شاعر کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ ۱۲۹۰ھ میں وفات پائی۔ قدر بلگرامی نے

تاریخ وفات لکھی ہے :-

ماہِ جمادی الاول یکشنبہ و دہم — شب آفتا بکے بہ زمین پے فسردہ وائے
یعنی بمرد ڈپٹی عباس بیگ خاں — ہے ہے گلے بہ باغِ امارت فسردہ وائے
برخواند قدر مو بہ تاریخ ہجر لیش — عباس بیگ خان بہادر بمردہ وائے

ڈپٹی عباس بیگ کے صرف ایک صاجزادی " وجیہہ النسار " تھیں جن کی شادی انھوں نے اپنے حقیقی بھتیجے مرزا محمود بیگ فرزند مرزا عاشور بیگ کے ساتھ کردی تھی جن کے کوئی اولاد نہیں ہوئی ! " وجیہہ النسار کی شادی " سیتاپور کی تاریخی شادیوں میں ایک خاص تقریب تھی جس کے تذکرے میرے بچپن تک بڑے افسانوی رنگ میں ہوا کرتے تھے ۔ اس وقت تک سیتاپور کے رؤسار اور عمائدین کے یہاں شادی بیاہ کی تقریبات میں اودھ کے رسم ورواج ہی برتے جاتے تھے ۔ دلی کے دو ایک خاندان جو اس وقت تک یہاں پہنچتے تھے ، ان میں ایسی شاندار تقریب اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی ۔ یہی وہ تقریب شادی تھی جس میں عدم شرکت کا افسوس غالب نے مذکورہ بالا خط (بنام قدر بلگرامی) میں کیسا ہے ۔

غالبیات کا یہ ایک اہم المیہ ہے کہ غالب کا دل اپنے بھانجوں کی طرف سے صاف نہیں تھا ۔ انھیں ان لوگوں سے غالباً یہ شکایت تھی کہ پنشن کے مقدمہ میں وہ اپنے چچا جواد الدولہ مرزا افضل بیگ کے رویّہ سے اظہار بیزاری نہ کر سکے تھے اور کسی نہج پر غالب کے معین ومددگار نہیں ہوئے تھے ۔ غالب کو اپنے بھانجوں سے توقع تھی ۔ اور غلط نہیں نہیں تھی کہ اس بُرے وقت میں وہ ان کا ساتھ دیں گے لیکن قرائن یہ کہتے ہیں کہ اس وقت اس خاندان کے اندرونی مسائل کچھ اتنے پیچیدہ ہو گئے تھے کہ ان کی بہن کی اولاد ان کا ساتھ نہ دے سکی ۔ اِن پیچیدگیوں کے اور جو وجوہ رہے ہوں ان کا پتہ تو چلتا نہیں لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ جواد الدولہ مرزا افضل بیگ پنشن کے معاملے میں اپنے حقیقی بہنوئی خواجہ حاجی خان اور ان کی اولاد کے معین ومددگار تھے ۔ اور یہ خواجہ حاجی خان وہی بزرگ تھے جن کی اولاد پنشن کے مقدمہ میں غالب کی فریق مخالف تھی ، مولانا

غلام رسول مہر کا بیان ہے:

یہ بھی حقیقت ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں مرزا غالب کے مقابلے میں بدرجہا ذی وسائل تھے۔ وہ انگریز ریذیڈنٹوں پر اثر ڈال سکتے تھے۔ مرزا افضل بیگ (جواد الدولہ) کلکتہ میں شاہ دہلی کا وکیل تھا اور نواب شمس الدین خاں کے لئے نہیں، لیکن اپنے بھانجوں (ابنائے خواجہ حاجی) کے لئے تمام ممکن تدبیریں کرتا رہتا تھا یہاں تک کہ ایک مرتبہ مرزا غالب کے خلاف "جامِ جہاں نما" (کلکتہ) میں کوئی تحریر شائع کرا دی چنانچہ مرزا ایک خط میں لکھتے ہیں:

"امروز تازہ حالے بہ مشاہدہ اوراق "جامِ جہاں نما" روئے دادہ کہ جز بر آں بے آبروئی نتوانستم کرد غالب کہ شما ہم دراں اوراق نگرستہ باشید۔ واللہ باللہ۔ ثم تاللہ، آنچہ از حالِ منِ مسکین در آں ورق مندرج است ہمہ کذب و بہتان و گذاف است۔"

(صفحہ ۱۳۷۔ احوالِ غالب۔ مطبوعات انجمن ترقی اُردو ہند)

عرض کیا جا چکا ہے کہ ڈپٹی عباس بیگ انقلاب ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے سیتا پور پہنچ گئے تھے اور یہ زمانہ وہ تھا جب غالب کے عزیز دوست مولانا فضلِ حق خیر آبادی بھی بقیدِ حیات تھے جو ہر سال آموں کی فصل میں خیر آباد ضرور آتے تھے اور ہمیشہ پابندی کے ساتھ غالب کے لئے آموں کا تحفہ بھیجا کرتے تھے۔ سیتا پور اور خیر آباد میں صرف پانچ میل کا فاصلہ تھا۔ اگر غالب کبھی آموں کی فصل میں خیر آباد آجاتے تو اپنے بھانجوں سے بھی مل سکتے تھے اور اس خاندان کے ان بچوں میں بھی وقت گذار سکتے تھے جو ان کی بہن کے پوتے تھے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ وہ تمام عمر نہ سیتا پور آئے اور نہ خیر آباد اور اس خاندان سے رفتہ رفتہ اتنی دوری ہو گئی کہ دس سال ادھر جب میں اس خاندان کے ان معمر افراد سے ملا جو سیتا پور میں اقامت گزیں ہیں تو انھوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ غالب اور ان کے درمیان میں کیا رشتہ ہے؟ ظاہر ہے کہ اس

"کم آگہی" کے بعد اس خاندان میں غالب کا کوئی خط یا تحریر دستیاب ہونے کا امکان ہی نہیں۔

خطوطِ غالبؔ کے جتنے مجموعے اس وقت تک سامنے آئے ہیں ان میں اعزّہ کے نام کوئی خط نہیں ہے۔ اس سلسلے کے صرف دو خطوط اب تک مجھے دستیاب ہو سکے ہیں جو اب سے پینتیس سال قبل ماہنامہ "خیاباں" لکھنؤ کے مخصوص عنوان "گنج شائگاں" کے تحت شائع ہوئے تھے جن پر سید شہنشاہ حسین رضوی مرحوم (ایڈیٹر خیاباں) نے ایک تفصیلی نوٹ بھی تحریر فرمایا تھا۔

ذیل کے ہر دو خطوط نواب سید محمد ذکی علی ہاتفؔ لکھنوی کا عطیہ ہیں، پہلا خط مرزا عباس بہادر اور دوسرا خط محمود مرزا کے نام ہے اور دونوں صبح شنبہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء کو لکھے گئے ہیں اور آج سے قبل شائع نہیں ہوئے ہیں۔ مکتوب الیہم اپنے زمانے میں غیر معرف نہ تھے لیکن اب ان کے حالات سے واقفیت رکھنے والے بہت کم ہیں۔ مرزا عباس بہادر سے مراد ڈپٹی مرزا عباس بیگ مرحوم ہیں جو لکھنؤ خیالی گنج کچہری روشن الدولہ کے جانب جنوب میں رہتے تھے۔ یہ کوٹھی امپرومنٹ ٹرسٹ لکھنؤ نے آرائش بلدہ کی اسکیم میں لے کر منہدم کرادی اور اب اس کا نشان تک باقی نہیں۔

مرزا عباس بیگ درحقیقت مرزا غالب مرحوم کے بھانجے تھے لیکن محبت اور بے تکلفی سے خط میں لفظ بھائی سے مخاطب کیا ہے۔ محمود مرزا جن کے نام دوسرا خط ہے ڈپٹی مرزا محمود بیگ کے نام سے موسوم تھے اور مرزا عباس بیگ کے بھتیجے تھے۔ مرزا خداداد بیگ اور مرزا رفیع الدین بیگ جن کی خیر و عافیت محمود مرزا کے خط میں مرزا نے دریافت کی ہے، محمود مرزا کے حقیقی بھائی تھے۔ خداداد بیگ اور مرزا رفیع الدین بیگ کا بھی انتقال ہو گیا۔ نواب سرور جنگ بہادر جن کا حال میں انتقال ہوا ہے، محمود مرزا کے چچازاد بھائی اور مرزا عباس بیگ کے بھتیجے تھے۔ اس خاندان کے بعض ارکان مختلف مقامات پر موجود ہیں اور ممتاز عہدوں پر فائز ہیں۔ خود مرزا

محمود بیگ بھی ڈپٹی کلکٹر تھے۔

قدرؔ بلگرامی کے نام (مرزا غالبؔ) نے جو خط لکھا ہے اس میں بھی بھتیجے[1] کی شادی میں شریک نہ ہونے پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔ لہٰذا جہاں تک واقعات کا تعلق ہے ذیل کے خطوط کی تصدیق قدر بلگرامی کے نام کے خط سے ہوتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرزا نے انتقال سے کچھ زمانہ قبل اپنے ہاتھ سے خط لکھنا چھوڑ دیا تھا لیکن خطوط ذیل مئی ۱۸۶۲ء میں لکھے گئے ہیں اور مرزا نے ۱۸۶۸ء[2] میں انتقال کیا لہٰذا ہر دو خطوط ان کی وفات سے پانچ سال قبل لکھے گئے ہیں اور اس امر میں مطلق اشتباہ کی گنجائش پیدا نہیں کرتے کہ وہ مرزا (غالبؔ) کے قلم کے لکھے ہوئے ہیں۔

دونوں خطوط ہندوستانی قلم اور سیاہ روشنائی سے لکھے گئے ہیں اور ایک ہی ورق پر۔ پہلا خط دو صفحات پر ہے اور دوسرا تیسرے صفحہ پر۔ چوتھا (صفحہ) سادہ ہے خط روشن اور پاکیزہ ہے ہم نے صرف دوسرے خط کا عکس شائع کیا ہے پہلا (خط) طویل بھی ہے اور جا بجا سے کرم خوردہ بھی۔

ہر دو خطوط نواب سید محمد ذکی علی خاں ہاتف کو نواب سید محمد قاسم عرف نواب ابراہیم مرزا خان خلف نواب یوسف مرزا خان مرحوم سے حاصل ہوئے تھے اور یوسف مرزا کو مرزا (غالبؔ) کے محبوب تلامذہ میں سے تھے اور ان کے نام اکثر خطوط 'اُردوئے معلیٰ'، 'عودِ ہندی'، میں شائع ہوئے ہیں ممکن ہے یوسف مرزا کو مرزا (غالبؔ) کے خطوط جمع کرنے کا خیال پیدا ہوا ہو اور انھوں نے مرزا عباس بیگ اور محمود مرزا سے خطوطِ منقولہ ذیل کو حاصل کر لیا ہو" (مدیر مرتب) ماہنامہ خیابان لکھنؤ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۳۳ء جلد ۲ شمارہ ۲۔

---

[1] مرزا محمود بیگ غالبؔ کے پوتے تھے بھتیجے نہیں۔ اور ڈپٹی عباس بیگ کی صاحبزادی وجیہہ النساء رشتے میں غالب کی پوتی ہی تھیں جن کے ساتھ مرزا محمود بیگ کی شادی ہوئی تھیں۔

[2] غالب کا سنِ وفات ۱۸۶۹ء ہے ۱۸۶۸ء نہیں

نواب ذکی علی خاں ہاتفؔ لکھنوی جن کی وساطت سے یہ دونوں خطوط سید شہنشاہ حسین مرحوم کو حاصل ہوئے تھے، بہت ہی بلند علمی اور ادبی مذاق رکھتے تھے۔ پروفیسر مسعود حسن ادیبؔ نے انھیں بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ فرماتے ہیں "لکھنویات" پر انھوں نے ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر رکھا تھا آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ قدیم لکھنؤ کے "رنگوں" پر ایک تحقیقی کتاب بھی ان کی تصانیف میں شامل ہے جو غالباً چھپی نہیں۔ ہاتفؔ کا کتب خانہ اپنے علمی و ادبی افادیت کے اعتبار سے اپنے زمانہ میں لکھنؤ کا ایک ممتاز کتب خانہ تھا۔

نصف صدی سے زیادہ زمانہ گذرا جب ہاتفؔ نے لکھنؤ سے ایک مذہبی ماہنامہ "تبصرہ" بھی جاری کیا تھا، جس کا پہلا شمارہ رجب المرجب ۱۳۲۷ھ میں نکلا تھا یہ رسالہ انجمن "مبشر الایمان لکھنؤ" کا آرگن تھا اور مفت تقسیم کیا جاتا تھا۔

ذیل میں یہ دونوں خطوط ماہنامہ خیابان لکھنؤ بابتہ ماہ نومبر ۱۹۲۳ء سے نقل کئے جا رہے ہیں جو بلاشبہ غالبیات میں ایک اہم اضافہ ہیں۔

(۱)

بھائی مرزا عباس بہادر۔

میں حیران ہوں کہ تم سرکار کے کام کو کیونکر انجام دیتے ہو؟ اور مضامین قوانین کو کس طرح سمجھ لیتے ہو۔ اور مقدمات مرجوعہ کس اسلوب سے فیصل کرتے ہو۔ مجھ کو نواب گورنر جنرل بہادر کا دربار کب نصیب ہوا۔ نہ انھوں نے دلّی میں دربار کیا نہ میں انبالی[۱] گیا۔ مَیں نے تم کو لکھا کہ ادھر تو مجھ کو اپنے فرزند[۲] کی شادی میں شریک نہ ہونے کا رنج رہا۔ ادھر دربار میں حاضر نہ ہونے کا غم رہا۔ اخبار میں

۱؎ انبالہ۔

۲؎ مرزا محمود بیگ اور وجیہہ النساء کی شادی کی طرف اشارہ ہے۔

مَیں نے نواب لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب یعنی منٹ گمری صاحب (MONT GOMRY) اور ان کے سکتر (سکریٹری) تامس ڈگلس فورساتھ صاحب (THOMAS DIGLAS FORSYTHE) اور ان کے منشی پنڈت[۱] من پھول سنگھ ..... [۲] کو اس کا سبب جانتے ہو وہ میر منشی لفٹننٹ گورنر کے ہیں ان کو گورنر جنرل کی سرکار میں کیا دخل - مجھ کو ہرگز دیدار نواب گورنر جنرل لارڈ الگن بہادر (LORD ELGIN) کا نصیب نہیں ہوا - ہاں جب نواب لفٹننٹ گورنر منٹگمری بہادر اس شہر میں آئے تو مجھ کو یاد کیا - بہت عنایت فرمائی اور ایک شال رومال سوزن کار اور ایک گلو بند سوزن کا اور ایک الوان کی فرد چار گز لمبی - یہ تین کپڑے مجھ کو دئے میں نے عرض کیا یہ میرا موجب اعزاز و افتخار ہے - مگر میری جان اُلجھی ہوئی ہے، لارڈ صاحب کے دربار اور خلعت میں - ! فرمایا - اچھا - اچھا -

دوسرے دن لارڈ صاحب آئے ......[۳] تیرے دن میں لفٹننٹ گورنر پنجاب سے رخصت ہونے گیا - پھر میں نے عرض کیا کہ مَیں ہمیشہ لارڈ صاحب کے دربار سے سنہرے اسا ورے کے سات پارچے اور جیغہ سرپیچ بالائی

---

[۱] پنڈت من پھول سنگھ اپنے عہد کی بڑی پراسرار شخصیت تھے - ۱۸۶۵ء کی جنگ کریمیا کے سلسلے میں انگریزوں نے ڈاکٹر لائیٹر کی سرکردگی میں تاشقند و بخارا جو خفیہ سیاسی مشن بھیجا تھا اس میں محمد حسین آزاد کے ساتھ پنڈت من پھول بھی گئے تھے - ان لوگوں نے بھیس بدل کر بہت دنوں تک اس روسی علاقے کی سیاحت کی جس کے بارے میں انگریز فوجی معلومات کرنا چاہتے تھے -

[۲-۳] کرم خوردہ (نادم سیتاپوری)

مرواریدمتن رقم ہمیشہ پایا کیا ہوں اور اب میرا دربار اور خلعت بند ہے اس کا مجھ کو بڑا غم ہے۔ فرمایا کہ غم نہ کرو تمہارا دربار اور خلعت کھل گیا۔ انبالے جاؤ گے تو خلعت پاؤ گے۔ مَیں نے اپنا ہاتھ دکھایا اور کہا کہ حضرت بوڑھا ہوں اور زخمی ہوں انبالے کیس طرح جاؤں۔ ..... [1]! خیر آیندہ دربار میں پاؤ گے۔

جو عرضی انگریزی تم نے میری طرف سے لکھ کر مجھ کو بھیجی تھی اور میں نے اپنی مُہر کر کے رجسٹری کروا کے کلکتے بھیجی تھی اس کا کچھ میں نے جواب نہیں پایا۔ شاید یہ حکم اسی عرضی پر ہوا ہو۔ لیکن اس عرضی کو گئے بہت دن ہوئے اور دربار اور خلعت کے واگذاشت کا حکم اب صادر ہوا ہے۔ چنانچہ مولوی اظہار حسین خاں میر منشی کہتے تھے کہ لارڈ صاحب تمہارے دربار اور خلعت کے واگذاشت کا حکم دے کر کلکتے سے ادھر کو روانہ ہوئے ہیں دوسرے یہ کہ نواب گورنر جنرل بہادر کا نام لارڈ الگن بہادر ہے اور چیف سکتر بہادر کا کرنل ڈورینڈھی بہادر نام ہے۔ ہارنگٹن صاحب شاید سالِ آیندہ میں سکتر یا پریویٹ سکتر ہوں یا کونسل کے ممبر ہوں۔ بہر حال اگر تمہارے سبب سے یہ کام ہوا تو کیا غضب ہوا۔ مگر اتنا جان لو کہ واگذاشت کا حکم سنتا ہوں کہ ہو گیا ہے۔ میرے پاس تحریر اس حکم کی نہیں پہنچی اور تعمیل بھی ابھی نہیں ہوئی۔ یعنی نہ میں دربار میں گیا نہ خلعت پایا۔ نواب لفٹنٹ گورنر بہادر کی ملاقات اور ان کا خلعت اور

---

[1] کرم خوردہ (نادم سیتاپوری)

امر ہے۔ اور بات ہے۔ اور اس بات سے اس کو علاقہ نہیں۔!

اب میں نے جناب کرنل دورینڈ صاحب بہادر چیف کو فارسی خط بھیجا ہے اور دو کاغذ انگریزی آمدہ ولایت اس خط کے ساتھ بھیجے ہیں جاننا چاہیے کہ گورنمنٹ سے میرے واسطے تین دستوری مقرر کیجا رہی ہے۔ دربار۔ خلعت۔ خط۔ بعد غدر کے یہ تینوں بدستور بند ہو گئے۔ اب دربار اور خلعت کی واگذاشت کی خبر سن کر سکتر صاحب کو خط لکھا ہے۔ جواب کے آنے پر دلجمعی کا مدار ہے اگر جواب آیا تو تم کو ضرور اطلاع دوں گا۔ ۱۲

واسطے خدا کے ان سطروں کو غور سے دیکھنا اور مطالب کو اچھی طرح سمجھ لینا اور غلط نہ سمجھنا۔ دوسرا ورق بنام محمود[۱] مرزا کے ہے اس کو دینا اور اگر تمہارے پاس نہ ہو تو جہاں ہو بھیجدینا۔ ۱۲

راقم غالب

مرقومہ صبح سہ شنبہ۔ ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۸۶۳ء

(ضروری جواب طلب)

(۲)

برخوردار اقبال نشان محمود مرزا کو دعا پہنچے۔

بھائی ـــــ میں تمہارا خط دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ خط تمہارا اچھا ہے خدا کرے "خط سرنوشت" بھی اچھا ہو۔ خدا کی

---

[۱] مرزا محمود بیگ خلف عاشور بیگ۔

قسم تمہارے سہرے کے دیکھنے کی بہت خوشی تھی ۔ مگر نہ آسکا!

اگر جیتا رہا اور اسباب نے مساعدت کی تو اکتوبر۔ نومبر یعنی جاڑوں میں آؤں گا۔ اور تم لوگوں کو دیکھوں گا۔۱۲

پھوڑا اب اچھا ہوگیا ہے ۔ خاطر جمع رکھو۔ چھ مہینے کے دن رات ٹیس نے جو روح تحلیل کی ہے اب بڑھاپے میں وہ پھر کہاں سے آئے۔

بیٹا۔ تیرے سر کی قسم! اگر میں لنگ باندھے ہوئے ننگا بیٹھا ہوں تو میری شکل "آکھ" کی بڑھیا کی سی ہوگی شاید ہوا کے جھونکے سے) اُڑ جاؤں ۔ جب مجھ کو دیکھو گے تب جانو گے کیا حال ہے۔۱۲

تمہارے چچا (ڈپٹی عباس بیگ) اللہ میاں کے "مست خود پرست" بندے ہیں ۔ بات ہے کچھ۔ سمجھتے ہیں کچھ۔ نہ اخبار کا مطلب سمجھے نہ میرا حال ۔ نہ میرا مقدمہ۔ نہ جو کچھ واقع ہوا اس کو سمجھے۔ اب میں نے ان کو ایک خط جداگانہ لکھا ہے ۔ اپنی طرف سے اظہارِ حال میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ خدا کرے سمجھ جائیں ۔ لیکن مجھ کو توقع نہیں کہ سمجھیں ۔ !

تم نے اپنی والدہ کی اور اپنی بھاوج کی اور خداداد اور رفیع الدین کی .... نہ لکھی۔ اب جو خط لکھو تو ان سب کی خیر و عافیتیں لکھو۔

غالب سہ شنبہ ۲۳ ذی قعدہ ۱۲۷۹ھ

۱۲ مئی سنہ حال

ان دونوں خطوط سے غالبؔ کی اس فطری گیرائی وگہرائی کا پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے اعزہ، احباب اور تلامذہ سے خوشگوار تعلقات استوار رکھنے کے لئے کیسے صبر آزما لمحات کا سامنا کیا۔ ان کے صاحبِ ثروت بھانجوں نے اپنے بوڑھے ماموں کی کبھی کوئی خبر گیری نہیں کی لیکن ان کے لب پر کبھی بھی کوئی حرفِ شکایت نہیں آیا۔ ڈپٹی عباس بیگ کے علاقہ "بڑا گاؤں" کی آمدنی پچیس تیس ہزار روپیہ سالانہ تھی۔ ساٹھ روپیہ ماہانہ قدر بلگرامی کو بلا کسی صلہ خدمت کے ہمیشہ دیتے رہے۔ لیکن غالبؔ کے ساتھ کبھی مسلوک نہیں ہوئے۔ غالبؔ کی صبر آزما صلح پسندی اور صلح جوئی ان کا خاصہ مزاج تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب پنشن کے مقدمہ کا فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا تو انھوں نے خواجہ حاجی خاں کے بیٹے بدرالدین امانؔ سے مواخاتی رشتہ کی تجدید کر لی۔ مولانا غلام رسول مہر تحریر فرماتے ہیں:۔

> " البتہ یہ درست ہے کہ جب جھگڑے مٹ گئے پنشن
> کے مقدمہ کا فیصلہ مرزا غالب کے خلاف صادر ہو گیا
> تو خواجہ حاجی کے بیٹے بدرالدّین امانؔ کے ساتھ ربط
> ضبط نئے سرے سے پیدا ہو گیا اور مرزا انھیں اپنا بھتیجا
> کہنے لگے۔"

(صفحہ ۱۳۲ ۔ احوال غالبؔ)

مرزا محمود بیگ کے خط میں غالبؔ نے ڈپٹی عباس بیگ کی "کج فہمی" کا تذکرہ کیا ہے؛ جو صحیح نہیں ہے۔ وہ حد درجہ معاملہ فہم اور دور اندیش انسان تھے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں ڈپٹی عباس بیگ کے خط میں جن باتوں کو پھیلا کر مکرر سہ کرر لکھا گیا ہے وہ ایسی باتیں نہیں ہیں جنھیں ڈپٹی عباس بیگ آسانی کے ساتھ نہ سمجھ سکے ہوں اسکا سبب صرف ایک یہی تھا، غالب کا بڑھاپا اور مسلسل بیماریاں۔

غالب کے متعلق چند غیر معتبر روایات

ذوالفقار

غالبؔ کے متعلق چند غیر معتبر روایات

غالب اپنی زندگی میں مقبول رہے ہوں یا نا مقبول۔ لیکن ان کی 'ہشت پہل' شخصیت اپنے عہد ہی میں مرکزِ توجہ بن چکی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے 'دامن شہرت' میں گلوں کے ساتھ کچھ خار بھی سمٹ آئے ہیں جنھیں اگر روایت نگاروں کی خوش نیتی سے الگ کر کے روایت و درایت کے اصولوں پر پرکھا جائے تو یہ روایتیں اس میزان پر پوری نہیں اترتیں۔ میں صاحب 'آب حیات' کے کمالِ فن تذکرہ نویسی کا بھی معترف ہوں اور ان کی نیک نیتی کا احترام بھی کرتا ہوں، مگر اس کے باوجود 'آب حیات' کے ان کمزور پہلوؤں کو متوازن تنقیدی جائزوں سے محروم نہیں کیا جا سکتا جن کی زد سے شاید ہی کوئی تذکرہ نگار بچا ہو۔ اس سلسلے میں "آبِ حیات" کا یہ مشہور لطیفہ 'روایت بالمعنیٰ' کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی دلچسپ کیوں نہ ہو، پھر بھی صاحب آب حیات نے اس کے سیاق و سباق کی یقیناً کوئی چھان بین نہیں کی اور اس عہد میں جس طرح سنا تھا، من و عن نقل کر دیا۔

> "مولوی فضل حق صاحب مرزا (غالب) کے بڑے گہرے دوست تھے۔ ایک دن میرزا ان کی ملاقات کو گئے۔ ان (مولانا فضل حق) کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتا تو خالق باری کا مصرع پڑھا کرتے تھے:
>
> بیا برادر آؤ رے بھائی
>
> چنانچہ میرزا صاحب کی تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہہ کر بٹھایا۔ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ مولوی صاحب

(فضل حق) کی 'رنڈی' بھی دوسرے دالان سے
اٹھ کر پاس آن بیٹھی۔ مرزا نے فرمایا، ہاں صاحب، اب
وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجیے۔

بہ نشیں مادر بیٹھ ری مائی" ؎

جہاں تک غالبؔ کی بدیہہ گوئی کا تعلق ہے، یہ لطیفہ ان کے کمالِ فن کا عکاس ہے، مگر اس کے ساتھ ہی مولانا 'فضل حق کی رنڈی' کا تذکرہ یقیناً درست نہیں ہے، کیونکہ اس عہد کے سب سے بڑے 'منکر حقائق' مرزا حیرت دہلوی نے اس واقعے کی تفصیلات میں مولانا فضل حق کی 'رنڈی' کا ذکر نہیں کیا ہے، حالانکہ یہ مرزا حیرت وہی ہیں جنھوں نے حضرت شاہ اسمٰعیل شہید سے 'غلو عقیدت' کی بنا پر ایشیا کے اس بڑے منطقی خاندان کی علمی عظمت سے انکار کر دیا تھا۔ اگر انھیں مولانا فضل حق کی اس کمزوری کا پتہ چل جاتا تو وہ 'آبِ حیات' سے زیادہ بڑھا چڑھا کر اسے پیش کرتے۔ مرزا حیرت نے اس لطیفے کو اس طرح نقل کیا ہے:

"کسبیوں کا ناچ ہو رہا تھا اور میرزا نوشہ (غالب) تشریف لائے انکے ایک بھائی نے جو ایک چھوٹی ریاست کے نواب تھے، امیر خسرو کی 'خالق باری' کا میرزا نوشہ کو دیکھ کے مصرع پڑھا:

بیا برادر آؤ رے بھائی

میرزا نوشہ نے بے ساختہ جواب دیا کہ دوسرا مصرع بھائی تم نے کس کے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ بی صاحبہ (یعنی طوائف) کی طرف خطاب کر کے پڑھ دو۔ اس پر مجلس میں بڑا قہقہہ پڑا۔ اور دوسرا مصرع ہے:

بہ نشین مادر بیٹھ ری مائی"

؎ آبِ حیات، ساتواں ایڈیشن ۱۹۱۳ء، صفحہ ۵۲۸/۵۲۷

(چراغ دہلی صفحہ ۳۲)

صحیح واقعہ کس طرح پر تھا اور کیا تھا۔؟ اس سلسلے میں تقریباً اسی عہد کی ایک روایت اور بھی ملتی ہے جو اس لحاظ سے قریب تر بھی جاسکتی ہے کیونکہ اسکے نقل کرنے والے غالبؔ کی حقیقی بہن چھوٹی خانم کے پوتے سرورجنگ[لہ] آغا مرزا بیگ ہیں، جنھوں نے کچھ زمانہ اپنے دادا (غالب) کا بھی پایا تھا اور پھر اپنی خاندانی روایات سے انھیں ایک خاص لگاؤ بھی تھا۔ سرورجنگ نے لکھا ہے:

"مرزا غالبؔ کی مولانا فضل حق (خیرآبادی) سے کمال دوستی تھی۔ ہر شب کو مولانا جو سررشتہ دار ریزیڈینٹ تھے، باہر صحن میں تخت پر بیٹھے ہوئے کچھ مسلیں دیکھ رہے تھے۔ ایک 'رنڈی' بھی اس امر کی منتظر کہ مولانا دیکھ لیں تو سلام کرکے بیٹھ جاؤں، کھڑی ہوئی تھی۔ اس عرصہ میں مرزا (غالب) لالٹین لئے آگے آگے پہنچے۔ مولانا (فضل حق) نے سر اُٹھا کر کہا:

(لہ) غالب کی حقیقی چھوٹی بہن 'چھوٹی خانم' دہلی کے سبز پوش، خاندان میں مرزا اکبر بیگ بدخشی کو بیاہی تھیں۔ مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل بیگ) اُن کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے اور سرورجنگ مرزا جواد بیگ کے سب سے بڑے بیٹے تھے۔ غالب کی انھیں بہن، چھوٹی خانم سے ان کے تین بھانجے اور ایک بھانجی امانی خانم تھیں جو نواب علی بخش خان لوہارو کو بیاہی گئی تھیں۔ انکی پوتی سکندر زمانی بیگم سرورجنگ کی اہلیہ تھیں، اس کے علاوہ سرورجنگ کی ساس عزیزالنسا مرزا غالبؔ کی حقیقی بھتیجی تھیں، یعنی مرزا یوسف کی اکلوتی صاحبزادی۔ اس لحاظ سے غالب اور سرورجنگ میں تہری رشتہ داریاں تھیں۔ سرورجنگ کے والد اپنے پورے خاندان کو لےکر ۱۸۵۷ء میں سیتاپور چلے آئے تھے جہاں انکے بڑے بھائی مرزا عباس بیگ مستقل طور پر رہ بس گئے تھے۔ سرورجنگ کی ابتدائی تعلیم سیتاپور اور لکھنؤ میں ہوئی، پھر اس خاندان کا بڑا حصہ دکن چلا گیا۔ سرورجنگ نظام دکن آصف جاہ سادس کے استاد تھے۔ زندگی کے آخری ایام میں علی گڑھ آگئے تھے، یہیں جون ۱۹۳۲ء میں وفات پائی۔ لاش دلی لے جائی گئی۔

بیا برادر آؤ رے بھائی

مرزا غالب نے کہا۔ دوسرا مصرع بھی پڑھ دیجئے کہ دیر سے (یہ) منتظر کھڑی ہے۔ دوسرا مصرع یہ ہے:

بہ نشین مادر بیٹھ ری مائی"

غالب کی زندگی میں اُن کا فن ہی نہیں شخصیت بھی ایک ایسی شہرت سے دوچار ہو چکی تھی جس کے پس منظر میں مشتبہ اور مشکوک روایات کا جنم پا جانا کچھ زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ پھر ان کے مرنے کے بعد تو تعریف سے تنقیص اور مدح سے قدح کے ایسے ایسے پہلو نکالے گئے جن کی مکمل تفصیلات بھی آج نہیں ملتیں۔ غالب کی وفات کے تیس سال بعد جب مجدد السنہ مشرقیہ مولانا سید احمد حسن شوکت میرٹھی کی شرح دیوان غالب چھپی تو اس میں نہ محض غالب کے فن کو شوکت میرٹھی کی تحریفات کا سامنا کرنا پڑا بلکہ شوکت نے بعض جگہ بغیر کسی حوالے کے نہایت ہی مبتذل واقعات کو غالب سے منسوب کر دیا۔ مندرجہ ذیل شعر:

میں مضطرب ہوں وصل میں خوفِ رقیب سے
ڈالا ہے تم کو وہم نے کس پیچ و تاب میں

کی شرح کرتے ہوئے شوکت میرٹھی تحریر فرماتے ہیں[۲]:

"۔۔۔۔ ہم کو معلوم ہوا ہے کہ جب مرزا غالب نے یہ شعر مشاعرے میں پڑھا تو ختم مشاعرہ کے بعد مولوی امام بخش صہبائی مرحوم نے جو ایک مقدس اور متورع بزرگ تھے مرزا صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اس شعر میں کیا معنیٰ پہنا دیے ہیں۔ مرزا صاحب نے کہا کہ مولانا آپ اس شعر کے معنیٰ کیا سمجھیں گے، نہ آپ نے رنڈی بازی کی، نہ خانگی بازی، نہ امرد بازی کی، نہ فاعل بنے نہ مفعول،

---

[۱] کارنامۂ سروری، مطبوعہ مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، حاشیہ صفحہ ۳۔

[۲] حل کلیات اردو، غالب دہلوی، شوکت المطابع میرٹھ، اکتوبر ۱۸۹۹ء۔

میں نے تو اپنا ایک واقعہ لکھا ہے۔ یعنی جس 'مسماۃ' پر
میں فریفتہ تھا، بڑی تدبیروں اور چالوں سے اس کو کسی
کونے کھدرے میں ڈھب چڑھایا۔ مگر اس خوف سے کہ
کوئی آ کھڑا ہوگا، رجولیت چوہے کے بل میں گھس گئی مسماۃ
سمجھی کہ غالب محض نامرد اور عنین ہے۔ میں نے معذرت
میں یہ شعر پڑھا۔"

ایسے بتذل اور غیر ادبی جھوٹ کی مثال شاید شوکت میرٹھی کے بعد مرزا واجد حسین یاس عظیم آبادی (یگانہ چنگیزی) ہی کے یہاں ملے تو ملے، دوسری جگہ ممکن نہیں۔ مرزا یاس (وفات ۱۹۵۲ء) نے اپنے رسالۂ عروض و قوافی (چراغِ سخن) میں بلا کسی حوالے کے ایک ایسی ہی من گڑھت حکایت تحریر فرمائی ہے:

" غالب پہ کیا؟ کتنے ہی ہونہار شاعر اس قوت متخیلہ
کی آزادی اور مطلق العنانی کی بدولت گمراہ ہوگئے اور
بعضے جو گمراہ ہوئے وہ اس وقت تک راہ پر نہیں آئے
جب تک قوت ممیزہ کو تخیل پر حاکم نہ بنالیا۔ ہائے میر
تقی میر! کیا جوہری سخن تھا، مرزا غالب کے شعر سن کر
صاف کہہ دیا کہ اس لڑکے کو اگر کوئی استاد کامل مل گیا
اور سیدھے راستے پر لگا دیا تو لاجواب شاعر بن جائے گا
ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔ وہی ہوا کہ غالب نے کسی کو استاد
نہ بنایا اور نہ راہ راست پر آئے۔ چنانچہ غالب کے
کسی بے تکلف دوست نے یہ شعر پڑھ کر ازراہ تمسخر
ان کی بہت تعریفیں کیں۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
بعد اس کے جزو کل بھینس کے انڈے سے نکال

غالب نہایت آزردہ ہوئے اور کہا۔ نہ معلوم کس مسخرے
نے یہ مطلع میری طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس پر ان کے
مہربان نے فرمایا کہ بھئی برا کیوں مانتے ہو، تمہارے شعر
تو ایسے ہوتے ہی ہیں۔"[1]

غالب کے فن اور شخصیت کے سلسلے میں اس قسم کی فرضی حکایتوں اور جھوٹی روایتوں کو خاصی اہمیت حاصل ہے، جنھیں احتیاط و توازن کے ساتھ اگر جانچا اور پرکھا نہ گیا تو غالبیات کے بہت سے گوشے تاریکی میں چلے جائیں گے۔

شوکت میرٹھی اور یاس عظیم آبادی کے بعد اس ضمن میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم (وفات ستمبر ۱۹۶۸ء) کا نام لاشعوری طور پر سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے ایسی ہی مشتبہ، مشکوک اور غلط روایات کا ایک "دفتر بے پایاں" چھوڑا ہے۔ ایک کثیر التصانیف مصنف کی حیثیت سے جو اہم ذمہ داریاں ان پر عاید ہوتی تھیں، افسوس کہ وہ کبھی ان کو پورا نہ کر سکے۔ "لطائف الشعرا" مفتی صاحب مرحوم کی ایک مشہور تصنیف ہے جس میں محض غالب ہی کے متعلق نہیں، بلکہ دیگر مشاہیر کے بارے میں بھی جابجا ایسی فرضی حکایتیں شامل کر دی گئی ہیں جن کا سر پیر نہیں۔ بعض جگہ فرضی کتابوں کے حوالے بھی ہیں لیکن زیادہ تر روایات ایسی ہیں جن کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ غالب کے متعلق جو لطائف اس کتاب میں نقل کیے گئے ہیں ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اس سے پہلے قبول عام حاصل کر چکے ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ ساتھ چند لطیفے ایسے بھی ہیں جو بہر قیمت غلط یا مشکوک اور مشتبہ ہیں۔ چند لطیفے ملاحظہ ہوں:

"مرزا غالب نے مولانا غلام امام شہید سے اپنے
خاص ظریفانہ انداز میں دریافت کیا، آپ شہید کب سے
ہوئے اور کیوں کر ہوئے؟ غلام امام نے فرمایا کہ جب سے
'کافر غالب ہوئے'۔ اور مرزا کا یہ شعر لکھ کر بھیج دیا:

---

[1] چراغِ سخن، صفحہ ۳۹، مطبع منشی نولکشور لکھنو، دسمبر ۱۹۲۱ء۔

با من میاویز اے پدر فرزند آذر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر دینِ بزرگاں خوش نکرد

مرزا مسکرا کر رہ گئے" [1]

اسی طرح ایک دوسرے لطیفے (دلی کی ادبی صحبت) میں تحریر فرمایا ہے:-

"حکیم مومن خاں مومنؔ کے یہاں احباب کا مجمع تھا۔ مرزا غالبؔ، نواب شیفتہؔ، مفتی صدرالدین آزردہؔ، حکیم آغا جان عیشؔ سے حضرات شریک صحبت تھے۔ قاضی نجم الدین برق آبادی بھی حکیم صاحب (مومن) سے ملاقات کے لئے حاضر ہوئے۔ ناسخؔ لکھنوی کے کلام پر بحث تھی، میر تقی میرؔ کا ذکر آگیا، مرزا غالبؔ فی البدیہہ فرماتے ہیں:

غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بقولِ ناسخؔ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں

عیشؔ کہنے لگے، استاد ناسخؔ نے کیا خوب شعر کہا ہے:-

یوں نزاکت سے گراں سرمہ ہے چشمِ یار پر
جس طرح ہو رات بھاری مردم بیمار پر

ہر ایک نے توجہ سے سنا اور داد دی۔ برقؔ سکندرآبادی نے دست بستہ عرض کی کہ حضرت ناسخؔ نے سرمہ چشمِ یار پر لکھ کر جدت کا ثبوت دیا ہے اور ہم سے نو آموزوں کے لئے اب تو سند ہو گئی اور ادھر استادوں نے توثیق بھی کر دی۔ حکیم صاحب بولے میاں برقؔ خوب بات پیدا کی اور معقول گرفت ہے۔" [2]

---

[1] لطائف الشعراء، مطبوعہ فاروقی پریس دہلی صفحہ ۲۳۔ [2] لطائف الشعراء، صفحہ ۳۰۔ ۲۹

یہ تیسرا لطیفہ (ذوقؔ و غالبؔ) بھی اسی رنگ میں ترتیب دیا گیا ہے:۔

"حضرت ذوقؔ اور مرزا غالبؔ میں شاعرانہ چشمک تھی۔ ذوقؔ کا قلعۂ معلی میں طوطی بول رہا تھا بادشاہ کے اُستاد کیا تھے جگت استاد بنے ہوئے تھے۔ اکثر شہزادے مرزا غالبؔ سے مانوس تھے، مرزا بلانے پر قلعہ جایا کرتے۔ حضرت ذوقؔ کی کوشش رہتی تھی کہ مرزا اسداللہ خاں کا کہیں قلعہ میں پالا نہ جم جائے تو اس کی ریختہ گوئی پر حرف گیری کیا کرتے۔ خضر سلطان کو مرزا سے تلمذ تھا، انھوں نے قلعہ والوں کی باتیں جا لگائیں۔ مرزا فرماتے ہیں:۔

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اُردو کہ بے رنگ من است
راست می گویم من واز راست سر نتواں کشید
ہرچہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است[۱]

اسی قسم کا ایک اور لطیفہ (تازہ نہال)، بھی غالبؔ کے ایک شعر سے گڑھا گیا ہے:۔

" مرزا غالبؔ قلعۂ معلیٰ میں جب جاتے تو حضرت سلطان[۲] آپ کی بڑی خاطر مدارات کرتا اور جہاں مرزا پہنچے اور اپنے والد ماجد بہادر شاہ سے جا کر کہا۔ مرزا صاحب آئے ہیں۔ حضور بادشاہ سلامت جلد باریابی کا موقع عطا فرما دیتے، ورنہ حضرت ذوقؔ کے مقابلے میں کسی کی دال گلنے والی نہ تھی۔ ایک دن بادشاہ سے

---

[۱] لطائف الشعراء، صفحہ ۳۱ ۔ ۳۰

[۲] 'حضرت سلطان'، غالباً کتابت کی غلطی ہے 'خضر سلطان' ہونا چاہئے۔

مرزا صاحب (غالبؔ) نے خضر سلطان کے لئے کہا:-

خضر سلطاں کو رکھے خالق اکبر سرسبز
شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے"[1]

اور یہ لطیفہ بھی غالباً پہلی بار مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی وساطت سے اہل ادب تک پہنچا ہے:-

"مرزا غالب رام پور گئے ہوئے تھے۔ حضرت جلال (حکیم ضامن علی) مرزا صاحب سے ملنے آئے۔ شراب نوشی میں مصروف تھے، ایک جام مے ناب سے بھر کر جلال کے سامنے پیش کیا، انھوں نے کہا میں نہیں پیتا ہوں۔ مرزا نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا آج تو ابر ہے جلال نے کہا، حضرت مجھے اس سے رغبت نہیں ہے۔ غالب بولے، اجی حضرت ابر بھی ہے، سردی بھی ہے۔ آخر جلال جھلا سے گئے اور کہنے لگے، حضرت میں حرام جانتا ہوں۔ اس پر مرزا مسکرائے اور کہنے لگے، پھر یہ شعر آپ نے کیوں کر کہا:-

رات مے خوب سی پی صبح کو توبہ کر لی
رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی"[2]

ان لطائف کے سلسلے میں مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم نے کسی راوی کے حوالے کی ضرورت محسوس نہیں فرمائی اور ان لطیفوں کے سیاق و سباق سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ غالبؔ کے مختلف اشعار کو واقعات کا جامہ پہنا کر لطائف کے قالب میں ڈھال دیا گیا ہے۔ اول تو یہ روایات لطیفوں کے انداز میں کہیں دوسری جگہ نظر بھی نہیں آتیں، اور

---

[1] لطائف الشعرا صفحہ ۳۵-۳۶

[2] " ۲۹

اگر فرض کر لیا جائے کہ جس التزام کے ساتھ جلال لکھنوی اور غالب کی ملاقات کو قلم بند کیا گیا ہے، کسی حد تک سچ بھی ہو تب بھی اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ غالب نے جلال کا شعر پڑھ کر انھیں لاجواب کر دیا ہو۔

مفتی صاحب مرحوم نے کچھ لطیفوں کے ساتھ مولوی اکرام اللہ گوپاموی کی 'تصویر الشعرا' کا حوالہ بھی دیا ہے مگر یہ تحریر نہیں فرمایا ہے کہ یہ کتاب کب لکھی گئی۔ اور کہاں ہے' یا مخطوطے کی شکل میں کس کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اور نہ اس کتاب (لطائف الشعرا) میں مولوی اکرام اللہ گوپاموی کے اس تعلق کو ظاہر فرمایا ہے جو مرزا غالب سے ظاہر کیا گیا ہے

'مولوی سید مدد علی تپش' کے عنوان سے لطائف الشعراء" میں اس شعر:۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

کو بھی غالب سے منسوب کر دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

"حضرت تپش مرزا صاحب (غالب) کے شاگرد تھے۔
مراسلت سے شاگرد ہوئے تھے۔ دلی مرزا صاحب سے
ملنے آئے۔ گھبراہٹ میں دیوان کا صاف شدہ مسودہ
بھول آئے۔ ایک دوسرا مجموعہ تھا وہ ہمراہ چلا آیا۔
مرزا صاحب سے اپنے دیوان کا ذکر کیا اور اس مجموعے
کو ملاحظہ سے گزارا، اس میں بہت تھوڑا کلام انکا تھا
باقی دوسروں کا کلام تھا، پوری پوری غزلیں بھی نہ
تھیں۔ مرزا صاحب (غالب) نے دیکھ کر کہا۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

تپش صاحب نے اس مجموعے کو واپس لے کر دیکھا
تو دیوان نہ تھا، دوسرا نسخہ تھا، جلد ایک سی بنی تھی اس سے

دھوکا ہوا۔ مرزا صاحب سے بھی معذرت کی اور دوبارہ وہ
دیوان لے جاکر دکھایا اور اصلاح لی۔ یہ دیوان انکے پوتے
منشی عبدالحمید تاج محلی کے یہاں بطور تبرک محفوظ ہے[۱]۔"

یہ شعر نہ تو غالب کا ہے، نہ سید مدد علی تپش اکبر آبادی کے دیوان سے اس کا کوئی تعلق ہے۔ بلکہ اس غلط انتساب سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے مصرع ثانی میں 'غالب' کے تخلص کو دیکھ کر ایک فرضی حکایت گڑھ دی گئی ہے۔ یہ شعر حقیقتاً عبداللہ خاں اوج کا ہے۔ جس کا ذکر 'آبِ حیات' میں موجود ہے۔

" اوج تخلص، عبداللہ خاں نام۔ ۴۰، ۵۰ برس کے مشاق تھے۔ ایسے بلند مضمون اور نازک خیال پیدا کرتے تھے کہ قابو میں نہ لا سکتے تھے اور انھیں عمدہ الفاظ میں ایسی چستی و درستی سے باندھتے تھے کہ وہ مضمون سما بھی نہ سکتا تھا۔ اس لئے کبھی تو مطلب کچھ کا کچھ ہوجاتا تھا اور کبھی کچھ بھی نہ رہتا تھا۔ سنگلاخ اور مشکل زمینوں میں غزل کہتے تھے، فکر مضامین اور تلاش الفاظ میں تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ غور کے ساتھ کاوش کرتے تھے اور آپ ہی آپ مزے لیتے تھے۔ ہونٹ چباتے چباتے ایک طرف سے سفید ہوگیا تھا۔ بعض دفعہ پڑھ کر کہتے تھے کہ آنکھوں سے لہو ٹپک پڑا تھا، جب یہ شعر کہا تھا۔ بعضے (شعر) پر کہتے تھے کہ چھ مہینے تک برابر بڑھتا رہا۔ پڑھتے اس زور شور سے تھے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔۔۔۔ مشاعروں میں غزل سناتے تھے تو صفِ مجلس سے آگے نکل جاتے تھے۔ بعض اشخاص شہر میں اور قلعے میں اکثر

۱؎ لطائف الشعرا صفحہ ۴۸۔

مرشد زادے (شہزادے) شاگرد تھے، مگر استاد سب کہتے تھے۔ شعرائے باکمال کو جاکر سناتے تھے، اور واہ واہ کی چیخیں اور تعریفوں کی فغاں و فریاد لے کر چھوڑتے تھے، کیونکہ اسے اپنا حق سمجھتے تھے۔ ذوق مرحوم باوجود کم سخنی اور عادت خاموشی کے "خوب خوب .... بہت خوب" کہتے اور مکرر پڑھواتے تھے۔ مسکراتے اور چہرے پر سرور ظاہر کرتے گویا شعر کی کیفیت میں بیٹھے ہیں۔ اور میرزا (غالب) تو ایسی دل لگی کے مصالحے ڈھونڈھتے پھرتے تھے کہ۔ "نعمت خدا دے"، شعر سنتے اور کہتے تھے کہ یہ سب کافر ہیں جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ شعر کے خدا ہو خدا! سجدے کا اشارہ کرتے اور کہتے سبحان اللہ! سبحان اللہ۔ میں ان دنوں میں مبتدی شوقین تھا۔ اپنا مشتاق سمجھ کر مجھے بہت خوش ہوتے تھے کہ بس تم ہمارے کلام کو سمجھتے ہو۔ رستے میں مل جاتے تو دس قدم دور سے دیکھ کر کھڑے ہو جاتے اور جو نیا شعر کہا ہوتا اسے وہیں سے اکڑ کر پڑھتے۔ پھر شعر سنتے سناتے چلتے، قلعے کے نیچے میدان میں گھنٹوں ٹہلتے اور شعر پڑھتے رہتے تھے۔ غریب خانے پر بھی تشریف لاتے اور پہر بھر سے کم نہ بیٹھتے تھے۔ ایک دن رستے میں ملے، دیکھتے ہی کہنے لگے، آج گیا تھا، انھیں (غالب کی طرف اشارہ ہے) بھی سنا آیا۔ میں نے کہا کیا؟ کڑک کر کہا:۔

ڈیڑھ جزو پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحبِ دیواں ہونا

غالب سے ایک 'نئے شعر' کا انتساب کرتے ہوئے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم نے ایک واقعے کو دو جگہ کھپانے کی کوشش کی ہے۔ مولانا عرشی رامپوری نے اس کی تفصیل ان الفاظ میں تحریر فرمائی ہے:۔

"یہ شعر مفتی انتظام اللہ شہابی نے 'انشائے بےخبر' کے دیباچے میں اس تمہید کے ساتھ لکھا ہے:

" ایک بار مرزا صاحب دہلی سے آگرے گئے تو نیل کے کٹڑے میں مجلسِ احباب منعقد ہوئی۔ مرزا حسام الدین بیگ، خواجہ غلام غوث بےخبر وغیرہ سخن سنج شریک مجلس تھے۔ شعر و شاعری کا چرچا تھا۔ اس زمانے میں فرقۂ اہلِ نشاط سے ایک رقاصہ 'صنم' تھی جس کا شہرہ بہت تھا اور وہ خود بھی فکرِ سخن کرتی تھی۔ وہ بھی شریک مجلس ہوئی، مرزا صاحب (غالب) نے فی البدیہہ (یہ شعر)[۵] ارشاد فرمایا"۔

" اس کے بعد مفتی صاحب (انتظام اللہ شہابی) نے اخبار قومی زبان کراچی بابت یکم دسمبر ۱۸۵۷ء[۶] میں " غالب اور ساحر" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا، اس میں لکھا ہے کہ:

'مرزا غالب آخری مرتبہ دہلی سے ۱۸۳۳ء یا ۱۸۳۴ء میں (اپنے) وطن (آگرہ) آئے، مرزا حسام الدین بیگ خلف مرزا مغل بیگ رئیس برارا کے یہاں چند روز

---

۵ سیہ چوٹی، زرافشاں مانگ، سبز اس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے

۶ یہ ٹائپ کی غلطی ہے، ۱۹۵۷ء ہونا چاہیے۔

مقیم رہے۔ ننھیال میں کوئی نہ رہا تھا، ماموں باندے
جاچکے تھے۔ مرزا صاحب کی تشریف آوری پر صحبتِ
احباب منعقد کی گئی ... صحبت میں مہر (مرزا حاتم علی
بیگ) راجہ (راجہ بلوان سنگھ) بے خبر (غلام غوث خاں
بے خبر) شیخ احمد علی شیون، میر زین العابدین شورش
وغیرہ شریک ہوئے۔ تمام اصحاب جمع ہو گئے تو صنم
زرق برق لباس میں آئی، اس پر غضب یہ تھا کہ سبز
دوشالہ اوڑھ رکھا تھا، پیشانی پر قشقہ لگا ہوا۔ داخلِ
محفل ہوئی۔ ہر ایک کی نگاہ اس پر پڑے بغیر نہ رہی۔
مرزا غالب بے ساختہ کہتے ہیں:

سیہ چوٹی زرافشاں مانگ سبز اس پر دوشالا ہے
تماشا ہے پرِ طاؤس میں کالے کو پالا ہے[1]"

بلاشبہ یہ شعر غالب کا نہیں ہے، لیکن اگر یہ واقعہ 'انشائے بے خبر' کی روایت تک محدود رہتا تو شاید 'من حیث الواقعہ' ایسی مضبوط گرفت میں نہ آسکتا جتنا 'قومی زبان' (کراچی) کی تفصیلات کے بعد واضح ہو گیا ہے، کیونکہ اس دوسری روایت میں صرف مرزا حاتم علی بیگ مہر کا نام ہی اس کے بے بنیاد ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ۱۸۵۷ء سے پہلے مرزا حاتم علی بیگ مہر کا کوئی تعلق کبھی آگرے سے نہیں رہا۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا آبائی مکان آج بھی کٹرہ ابوتراب خاں میں موجود ہے۔ شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد تھے۔ غدر کے بعد جب انگریزوں نے فتح پور سیکری کے پاس دو گاؤں جاگیر میں دئے تو پہلی بار آگرے سے ان کا تعلق قائم ہوا۔ اور اس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مرزا غالب کبھی آگرے گئے ہوں۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت لکھنوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

" ۱۸۵۷ء کے غدر میں سات انگریزوں کو اپنے گھر میں

---

[1] دیوان غالب، نسخۂ عرشی، صفحہ ۲۹۳۔

چھپایا، اس خدمت میں مرزا سخاوت علی بیگ اور مہر (مرزا حاتم علی بیگ) کے ماموں شریک تھے۔ پھر لکھنؤ سے ان کو آگرے لیگئے، گورنمنٹ سے اس خدمت کے صلے میں بائیس پارچہ کا خلعت مع مالائے مروارید اور گھوڑا اور اسلحہ عطا ہوئے اور جاگیر میں دو موضع قریب فتحپور (سیکری) مرحمت ہوئے۔ اب (مہر نے) اپنا قیام آگرے میں کر لیا اور وہیں ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔"[۵۱]

جناب مالک رام نے اس شعر کے سلسلے میں لکھا ہے:

" شرح غالب (صفحہ ۳۹۳) میں جناب عرشی صاحب نے اس شعر سے متعلق صاحب موصوف (مفتی انتظام اللہ شہابی) کے دو مختلف مضمونوں کے اقتباس دیئے ہیں دونوں کا مضمون ایک ہی ہے کہ جب مرزا غالب آخری مرتبہ، آگرے گئے تو وہاں محفلِ احباب میں ایک رنڈی 'صنم' نامی کو زرق برق لباس میں ملبوس، سبز دوشالہ اوڑھے دیکھا تو (مرزا غالب نے) فی البدیہہ یہ شعر پڑھا۔

مفتی صاحب نے خلاف معمول اس روایت کے لئے حوالہ نہیں دیا۔ بہرحال اگر وہ ایسا کرتے جب بھی قابل قبول نہ ہوتا میں افسوس کے ساتھ یہ ظاہر کرنے پر مجبور ہوں کہ شاید بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ مفتی صاحب روایتیں 'وضع' کرنے میں بہت مشاق ہیں۔ وہ بالعموم کسی قلمی کتاب کا نام اختراع کر کے اس کی سند دیں گے کہ یہ کتاب 'مفتیان گوپامؤ' (ضلع ہردوئی) کے کتب خانے

---

[۵۱] آب بقا، نول کشور پریس لکھنؤ، صفحہ ۱۱۹۔

میں ہے یا آرکاٹ (مدراس) کے شاہی کتاب خانے میں
زینت ہے یا کسی اور جگہ ہے۔ حالانکہ اس کا کہیں وجود
نہیں ہوتا۔ گوپامؤ میں خیر سے کوئی کتب خانہ ہے ہی نہیں
اور جن کتابوں سے متعلق انھوں نے بعض مضامین میں
'آرکاٹ'، کا نام لیا ہے۔ تحقیق سے وہ بھی غلط ثابت
ہوا ہے۔ وہ (مفتی صاحب) پچھلے ۲۵۔ ۳۰۔ برس
سے اس جعل کے مرتکب ہو رہے ہیں اور بہت لوگ
اس سے گمراہ ہوئے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان
کو اس پر متنبہ کیا جائے اور انکی کوئی روایت اس
وقت تک تسلیم نہ کیجائے جب تک کہ یہ کسی دوسری معتبر
شہادت سے درست نہ ہو۔ فی الحال اتنے اشارے پر
اکتفا کرتا ہوں۔ میں اس شعر کو محض مفتی صاحب کی
سند پر غالب کا تسلیم کرنے سے انکاری ہوں۔"[۱]

غیر معتبر اور غیر مستند روایات کے سلسلے میں جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے، انھیں الفاظ کی مستحق اسی عہد میں ایک اور شخصیت ہے جسے کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا عبدالباری آسی الدنی مرحوم (وفات ۱۹۴۶ء) اپنے دور کے ان باکمالوں میں تھے جنھیں اگر زمانہ چین سے بیٹھنے کی مہلت دیتا تو شاید آج اُردو ادب کی تاریخ میں وہ ایک ممتاز مقام حاصل کر چکے ہوتے۔ لیکن گردش ایام کی نامساعدت نے انھیں پل بھر کی مہلت نہ دی۔ لکھنؤ پہنچے بھی تو اس دور میں جب 'عزیز و یاس'، کی ادبی ہنگامہ آرائیوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ معرکہ چکبست و شرر، کا غبار بھی فضاؤں پر موجود تھا۔ لکھنوی اور غیر لکھنوی کی تلخیاں بھی باقی تھیں۔ اس اجنبی دیار میں زندہ رہنے کے لئے انھیں "نولکشور" کا سہارا لینا پڑا۔

---

[۱] سہ ماہی "فکر و نظر" علیگڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء، صفحہ ۱۵۲۔

اُردو اور فارسی کتابوں کی نشر و اشاعت کا شعبہ ان کے ہاتھ میں تھا۔ قابلِ اشاعت کتابوں کا انتخاب، ان کی ترتیب و تدوین، تشریح نگاری اور حواشی نویسی، سب کچھ انھیں سے متعلق تھا۔ ان کے زمانے میں بیشمار نئی اور پرانی کتابوں کا قابلِ قدر اضافہ ہوا۔ اور نولکشور پریس کو نشاہ ثانیہ نصیب ہوئی۔ اسی زمانے میں نیاز فتح پوری مرحوم 'نگار' کو لے کر بھوپال سے لکھنؤ پہنچ چکے تھے اور مقبول حسین وصلؔ بلگرامی بھی لکھنؤ کی بساط ادب پر جلوہ نما ہو چکے تھے۔ وصلؔ مرحوم کے یہاں روزانہ نشستوں کا سلسلہ شروع ہوا اور اسی کے ساتھ غالبؔ کے دیوان میں 'نیا اضافہ' ہونے لگا۔ کلام غالب میں کئی سو نئے اشعار شامل کر کے مولانا آسیؔ نے "مکمل شرح دیوان غالب" تصنیف فرمادی جسے صدیق بکڈپو لکھنؤ نے ۱۹۳۱ء میں شائع کیا۔

'مکمل شرح دیوان غالب' میں نہ محض غالبؔ کے نام سے جعلی کلام کا[۱] الحاق کیا گیا بلکہ کچھ ایسے نئے انکشافات بھی کئے گئے جن سے اہلِ علم و ادب اس وقت تک بے خبر تھے۔ مکمل شرح کے طویل مقدمے میں دو ایسی بیاضوں کی نشاندہی کی گئی جن میں غالب کا غیر مطبوعہ کلام سمویا گیا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی اس فاضلانہ مقدمے میں بعض ایسی باتیں بھی کہی گئیں جن کا کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔ چنانچہ جناب مالک رام جیسے محقق نے بلا کسی تحقیق کے تذکرہ "تلامذہ غالب" میں صرف مولانا آسی کے بیان کا سہارا لے کر منشی خلیفہ حسام الدین احمد الدنی کو غالب کا شاگرد لکھ دیا جو قطعاً ایک مشکوک و مشتبہ روایت ہے اور روایت و درایت کے جن اصولوں پر پرکھنے کے بعد جناب مالک رام نے مفتی انتظام اللہ شہابی کی روایات کو ماننے سے انکار کیا ہے، مولانا آسی بھی اس میزان پر پورے نہیں اترے۔

'مکمل شرح دیوان غالب'، کے اسی مقدمے میں مولانا آسی نے 'آب حیات' کی اس روایت کی تکذیب کرتے ہوئے "کہ غالب کا مروجہ دیوان مولانا فضل حق خیرآبادی اور مرزا خانی خان کا انتخاب کیا ہوا ہے" ایک سخت تنقید کی ہے اور ایک ایسی روایت تحریر فرمادی ہے جس کا کوئی ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مولانا آسی نے تحریر فرمایا ہے:

۱ے ملاحظہ ہو 'غالب کے کلام میں الحاقی عناصر'، شائع کردہ 'مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی'۔

"مرزا خانی (خان) ہوں یا مولانا فضل حق (خیرآبادی)
میرا ہرگز یہ خیال نہیں ہے کہ مرزا (غالب) ایسے غیور
طبع نے جگر پاروں کو ان کے حوالے کر کے ان کی زندگی
اور موت کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہوگا، غلط ہے'
یہ اور بات ہے کہ ان دونوں نے صلاحیں دی ہوں
اور مرزا نے ان کی دوستانہ صلاح کو مانا بھی ہو۔ مگر
یہ انتخاب مرزا ہی نے کیا ہے... خود میرے والد (خلیفہ
حسام الدین احمد الدنی) مرزا غالب کے دیکھنے والوں
میں تھے، ان کے کمالِ فن کے پورے راز داں تھے۔
وہ جب آزاد کا یہ 'آبِ حیات' والا لطیفہ دیکھتے تھے
کہ مرزا نے مولوی فضل حق سے انتخاب کرایا تو غصّے کے
مارے سُرخ ہو جاتے تھے اور فرماتے تھے کہ کیا بہتان
باندھا ہے۔
"والد صاحب بیان کرتے تھے کہ مرزا اصلاح دیگر
بعض شاگردوں سے ایک ہندو تمبولی کی نسبت
تو ضرور یہ کہتے تھے کہ ذرا اس کو بھی سنا لینا اور باقی
کسی کو وہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ صہبائیؔ (امام بخش) کو
ملائے مکتبی، آزردہؔ (مفتی صدر الدین) کو ایک حکمراں،
ذوقؔ کو بادشاہ کا استاد، مومنؔ کو لڑاکو جانتے تھے
اور ذرا بھی ان کی پروا نہ تھی۔"[۱]

قطع نظر اس سے کہ مروجہ دیوانِ غالب کے انتخاب کی نوعیت کیا تھی، مولانا آسی
اپنے والد منشی خلیفہ حسام الدین احمد کے بارے میں کوئی ثبوت اس کا پیش نہیں کر سکے

[۱] مکمل شرح دیوان غالب، مطبوعہ اشاعت العلوم لکھنؤ، صفحہ ۱۱-۹

کہ وہ غالب کے 'کمال فن کے پورے رازداں' تھے۔ غالب کا کوئی ایسا خط آج تک سامنے نہیں آسکا جس میں خلیفہ حسام الدین احمد کا ذکر کسی سلسلے میں آیا ہو۔ جناب مالک رام نے محض مولانا آسی کے خود نوشت حالات (مطبوعہ ماہنامہ نگار لکھنؤ، بابت جنوری فروری ۱۹۴۱ء) کو بنیاد بنا کر خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد اور 'کمال فن کا پورا رازداں' تصوّر کر لیا۔ حالانکہ انھیں خود نوشت حالات کے جس ٹکڑے پر جناب مالک رام نے یہ عظیم عمارت تعمیر فرمائی ہے، اگر اس کے صرف اسی حصّے پر توجہ فرما لیتے تو پوری بات سمجھ میں آجاتی۔ جناب مالک رام نے مولانا آسی کے خود نوشت حالات کا جو حصہ نقل کیا ہے، اس کی ابتدائی سطور یہ ہیں:

"حسام، خلیفہ حسام الدین احمد الدنی۔
ہاپوڑ (ضلع میرٹھ) کے نواح میں 'الدُن'، ایک قصبہ ہے، وہیں کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ شاعری گویا ورثے میں پائی تھی۔ ان کے والد مولوی شیخ خدا بخش بھی شاعر تھے، عاجز تخلص تھا۔ عاجز کے والد شیخ عبدالحکیم عرف میاں نھّن عاشق تخلص کرتے تھے۔ یہ میر تقی میرؔ کے ہم عصر اور جلیس تھے، آپس میں خوب صحبتیں رہتی تھیں اور ایک ساتھ شعر و شاعری سے شوق کرتے تھے..."[۱]

جس طرح غالب کے 'کمال فن کے رازدان'، (خلیفہ حسام الدین احمد) کا نام یا کوئی شعر آپ کو کسی تذکرے میں نہ ملے گا، اسی طرح تمام قدیم و جدید تذکرے میر تقی میرؔ کے ان 'ہم عصر اور جلیس' سے خالی نظر آئیں گے۔ اگر جناب مالک رام 'کلیات میر' مرتبہ مولانا آسی کے طویل مقدمے میں میرؔ کے ان ہم عصر اور جلیس' کو تلاش کرنے کی کوشش کرتے تو شاید بلا تصدیق خلیفہ حسام الدین احمد کو غالب کا شاگرد

---

[۱] تلامذۂ غالب، صفحہ ۹۴-۹۳۔

تسلیم نہ کرتے۔

مفتی انتظام اللہ شہابی مرحوم کی طرح مولانا آسی مرحوم کا ذہن بھی ہمیشہ احساس ذمہ داری سے خالی رہا اور ایسی ایسی روایتیں ان کے قلم سے بیساختہ نکل گئی ہیں جنھیں کوئی غیر تحقیقی ذہن وشعور بھی مشکل سے قبول کرے گا۔ ہندو تمبولی، کا ذکر مولانا آسی نے مذکورہ بالا روایت میں کیا ہے۔ اس کا ذکر آپ کو آزاد کے یہاں ملے گا نہ حالی کے یہاں۔ غالب کے کسی ہم عصر نے ایسے سخن فہم تمبولی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ اگر ایسی کوئی باذوق شخصیت دلی میں ہوتی تو آزاد و حالی نہ سہی، خواجہ حسن نظامی مولانا راشد الخیری اور ناصر نذیر فراق جیسے روایت نگار تو اسے کبھی فراموش نہ کرتے۔

مولانا آسی نے غالب کے اردو کلام میں الحاقی کلام تو شامل ہی کیا تھا، سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ ۱۹۲۵ء میں دیوانِ غالب (اردو) کا ایک نیا ایڈیشن نولکشور پریس لکھنؤ سے ایسا شائع کرایا جس میں ایک طرف تو نسخۂ حمیدیہ (مکتوبہ ۱۸۲۱ء مطبوعہ ۱۹۲۱ء) کا ایک انتخاب بھی "انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ مرزا غالب مرحوم" کے عنوان سے شامل کردیا اور نسخۂ حمیدیہ کے حوالے کے بغیر تحریر فرمایا:

> "چونکہ مرزا غالب کی غیر مطبوعہ غزلیں یا ؤ کلام جسے غالب نے خود قابل طبع نہ سمجھا تھا، اکثر بیدل اور شوکت، اسیر وغیرہ کے رنگ میں ہیں اور اس وجہ سے وہ بیحد الجھی ہوئی اور بعید الفہم ہیں، لہٰذا ان غزلوں میں سے وہ اشعار انتخاب کیے گئے جو اس رنگ میں بیحد سہل اور آسان ہیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ ان اشعار کو ان کے مروجہ دیوان کی غزلوں میں شامل کردیا جائے مگر چونکہ خود مرزا نے ان کو علیحدہ کردیا ہے لہٰذا ہم نے بھی مصنف مرحوم کا اتباع کیا۔"[۱]

---

[۱] دیوان غالب، ایڈیشن ۱۹۲۵ء صفحہ ۱۱۵۔

دوسری طرف اس دیوان میں حاشیے پر بعض اشعار کی شرح بھی کی گئی ہے، اور بے سر و پا روایات بلا کسی حوالے کے لکھ دی گئی ہیں۔ ۱۹۲۵ء کے ایڈیشن کا جو نسخہ میرے سامنے ہے اور اس پر سرورق نہیں ہے اس لئے یہ کہنا دشوار ہے کہ اس پر بحیثیت مرتب مولانا آسی کا نام ہے یا نہیں؟ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ یہ دیوان مولانا آسی ہی کا ترتیب دیا ہوا ہے اور شرح کے پیرائے میں جن اشعار پر غیر مستند روایات کے حواشی لکھے ہوئے ہیں، وہ سب مولانا ہی کی جدت طبع سے تعلق رکھتے ہیں۔ مولانا آسی مرحوم کے ایک قریبی دوست میرزا محمد عسکری بی۔اے نے اپنے خود نوشت حالات "من کیستم" میں مولانا آسی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"شاعر و ناقد و شارح، مشہور نولکشور پریس میں
بعہدہ مصحح و شارح ملازم ہیں، خوشا نصیب پریس
کے کہ ایسا گوہرِ بے بہا کوڑیوں کے مول مل گیا اور وہ
اس کی قدر نہیں کرتا۔"[۱]

اس ایڈیشن میں شرح کے پردے میں جو "روایت سازی" کی گئی ہے وہ دلچسپ بھی ہے اور افسوسناک بھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے ان اشعار کے 'پس منظر' میں جھانک کر کچھ تصوراتی خاکے بنا ڈالے ہیں جو اس دیوان کے حاشیوں کے سوا شاید کہیں بھی نظر نہ آئیں گے۔ اب آپ ان اشعار کے آئینے میں وہ روایات ملاحظہ فرمائیں جنھیں بلا کسی مستند حوالے کے اس دیوان غالب میں لکھا گیا ہے:

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

سنا ہے کہ غالب مرحوم نے یہ غزل قلعہ میں پڑھی
تھی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم نے جب یہ مقطع سنا تو
فرمایا کہ ہم تو اس وقت بھی آپ کو ایسا نہ سمجھتے۔ مرزا نے

---

[۱] من کیستم، نامی پریس لکھنؤ، ۱۹۴۳ء، صفحہ ۹۶۔

ازراہ شوخی عرض کیا کہ حضور تو اب بھی ایسا ہی کہتے ہیں مگر یہ اس لئے ارشاد ہوتا ہے کہ میں اپنی حالت پر مغرور نہ ہو جاوٴں۔ (صفحہ ۲۱)

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

ذوقؔ مرحوم اس شعر کو پڑھ کر پہروں سر دھنتے تھے اور غالبؔ کی تعریف ان الفاظ میں کرتے تھے کہ غالبؔ کو اپنے اچھے شعروں کی خود بھی خبر نہیں ہوتی۔ (صفحہ ۲۹)

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں
کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

مولانا آزردہؔ کبھی غالبؔ کے کسی شعر کی تعریف نہیں کرتے تھے۔ ایک دن کسی نے اچانک یہ شعر پڑھا، اور شعر میں صفائی کو پسند کرتے تھے۔ ایک دن کسی نے اچانک یہ شعر پڑھا، بھڑک گئے اور پوچھا یہ کس کا شعر ہے؟ کسی نے کہا۔ غالبؔ کا شعر ہے۔ جواب دیا کہ پھر اس میں مرزا کی کیا تعریف ہے، یہ تو ہماری روشِ خاص ہے اور اس کے مستحقِ ستائش ہمیں ٹھہرتے ہیں۔ (صفحہ ۵۴)

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے

ذوقؔ مرحوم کہیں پالکی میں بیٹھے جارہے تھے غالبؔ کی نظر پڑی، چونکہ ان سے ہم عصرانہ چشمک تھی، انھوں نے یہ مصرع فی البدیہہ کہہ کر پڑھا۔ ذوقؔ مرحوم نے سن لیا اور بادشاہ سے شکایت کی۔ بادشاہ نے غالبؔ کو بلوایا اور پوچھا کہ آج آپ نے کونسی غزل کہی ہے۔ انھوں نے پوری غزل سنائی۔ آخر میں مقطع میں یہ مصرع شامل کر کے سنادیا۔ (صفحہ ۹۱)

اس قسم کی متعدد روایات اس دیوان کے حاشیوں پر لکھدی گئی ہیں جن کے بارے میں کوئی قابل اعتبار ثبوت یا حوالہ نہیں دیا گیا ہے۔ جو مکالمات ان روایات میں درج کئے گئے ہیں یقیناً بے بنیاد اور من گڑھت ہیں۔

مولانا آسی کے مرتبہ دیوان غالب اردو کا ایک ہی ایڈیشن جون ۱۹۲۵ء میں نولکشور پریس لکھنؤ نے شائع کیا تھا کہ ۱۹۴۲ء میں مولانا کا انتقال ہوگیا۔ ان کے بعد مولوی امیر حسن نورانی (رکن شعبۂ طباعت دہلی یونیورسٹی) ان کے قائم مقام کی حیثیت سے نولکشور پریس کی راجہ رام کمار برانچ میں پہنچ گئے۔ ان کے زمانے میں اس دیوان غالب کے دو ایڈیشن ۱۹۵۷ء اور ۱۹۶۰ء میں شائع ہوئے جن کے سرورق پر مولوی امیر حسن نورانی کا نام اس التزام کے ساتھ چھپا ہوا ہے کہ "مع تصحیح و اضافہ حالاتِ زندگی" لیکن سوائے اس کے کہ مولانا آسی کے لکھے ہوئے حالات میں ردو بدل کیا گیا ہے، باقی ان ایڈیشنوں میں سب کچھ وہی موجود ہے جو مولانا آسی نے لکھا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۷ء کے ایڈیشن میں صفحہ ۱۱۵ پر "انتخاب غزلیات غیر مطبوعہ غالبؔ مرحوم" کی خوش خبری ۱۹۶۰ء کے ایڈیشن میں بھی موجود ہے اور صفحات ۱۲۴ و ۱۲۵ پر غالبؔ کا مشہور 'سہرا' شائع کرنے کے بعد لکھا گیا ہے کہ:

"یہاں تک 'غزلیں' دیوان غالب کی تمام ہوئیں۔
اب آگے قصائد اور قطعات ہیں۔"

مولانا نورانی کے تصحیح کیے ہوئے اڈیشنوں میں بھی یہ تمام فرضی حکایات بدستور موجود ہیں، کہیں ایک نقطے کا فرق نہیں۔ نسخۂ حمیدیہ کو چھپے ہوئے نصف صدی سے زیادہ زمانہ ہوگیا۔ اس کے نہ جانے کتنے انتخابات شائع ہو چکے مگر مولانا نورانی کے نزدیک یہ آج بھی ایسا نادر ذخیرہ ہے جس کی دریافت کا سہرا انھیں کے سر ہے۔

غالبؔ اور ریاضؔ خیرآبادی

غالبؔ اور ریاضؔ خیرآبادی

سید رئیس احمد جعفری مرحوم نے ریاضؔ خیرآبادی کی ابتدائی زندگی کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے:۔

"ریاضؔ نے قدیم شرفار کی طرح اپنی تعلیم کا آغاز فارسی سے کیا۔ سید طفیل احمد صاحب (ریاضؔ کے والد ماجد) خود فارسی اور عربی کے جید عالم تھے۔ فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ پھر عربی کے لئے "مدرسہ عربیہ" میں داخل ہوئے تعلیم کی تکمیل نہ ہونے پائی تھی کہ طبیعت شعر و سخن کی طرف مائل ہوئی اور تعلیم کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ نواب میر مظفر علی خان اسیرؔ کا طوطی بول رہا تھا۔ ریاضؔ نے اسیرؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اسیرؔ اگرچہ ریاضؔ سے بہت محبت کرتے تھے لیکن خود ریاضؔ ان سے زیادہ مانوس نہ ہو سکے۔

"ابتدار میں ان پر غالبؔ کا رنگ غالب تھا۔ چاہتے تھے انہی کی طرح مشکل الفاظ۔ پُرپیچ ترکیبوں اور ثقیل جملوں کو استعمال کر کے اُستاد (اسیرؔ) پر اپنی دھاک بٹھائیں۔ اسیرؔ اس اُپچ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتے تھے بلکہ انھوں نے انھیں (ریاضؔ) چڑھانے کیلئے یہ وطیرہ اختیار

کرلیا تھا کہ حضرت ریاضؔ نے "بغرض اصلاح" کوئی شعر
عرض کیا اور جناب اسیرؔ نے ہم نشینوں سے فرمایا۔۔۔
"بوجھیے" گویا ریاضؔ نے کوئی کہہ مکرانی یا پہیلی سنائی
تھی جسے "بوجھنے" کے لئے اسیرؔ صاحب حاضرینِ بزم کو
طبع آزمائی کی دعوت دیا کرتے تھے۔ ریاضؔ کو یہ چیز کھٹکی
تھی۔ لیکن سوا اس کے کہ۔ ع

ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم

کا ورد کرتے ہوئے قفسِ اسیرؔ سے واپس آجائیں اور
کر ہی کیا سکتے تھے۔ ریاضؔ کی خوش قسمتی سے یہ اسیرؔ کا
آخری زمانہ تھا امیرؔ (مینائی) عملاً ان کے جانشین بن چکے
تھے کچھ عرصے کے بعد اسیرؔ نے جان کا یہ جنجال امیرؔ (مینائی)
کے سپرد کردیا۔ ریاضؔ نے اپنا کلام انھیں دکھانا شروع
کردیا۔" (صفحہ ۶۰۔ ۶۱۔ "رندِ پارسا" (طبع اول

مطبوعات انجمن ترقیٔ اردو (ہند) ۱۹۴۵ء)

خود ریاضؔ مرحوم کا بیان ہے:۔

"میں نے ابتدائے سخن کے لئے "دیوانِ غالبؔ" کو
پسند کیا تھا۔ "دیوانِ غالبؔ" کے اشعار پر بہ ترتیب قافیہ
پیمائی کرتا۔ کلام جناب تدبیر الدولہ مدبر الملک منشی
مظفر علی خاں اسیرؔ شاگرد مصحفیؔ کو دکھاتا۔ اسیرؔ مرحوم
مجھ سے محبت کرتے مگر مرحوم کی خدمت سے میں اکثر اس
لئے پژمردہ واپس ہوتا کہ جناب اسیرؔ بساط نشینانِ صحبت
کو میرے اشعار "بوجھیے" کہہ کر سناتے۔ یہ امر خفت کا
باعث ہوتا یہاں تک کہ آخر میں اس خاص رنگ کا دیوان

اور کلام تلف کر دینا پڑا۔ طبیعت صفائی کا کلام اور
صحت کی طرف رجوع ہو گئی۔ سیتاپور اور خیرآباد میں
مشاعروں کا زور تھا۔ خیرآباد کے مشاعروں میں حضراتِ
سیتاپور بہ خصوصیت شریک ہوتے۔ سیتاپور کے مشاعروں
نے پچھلی نمود کو ترقی دے دی ۔۔۔"

(صفحہ ۲۶-۲۷، نثر ریاض خیرآبادی مطبوعہ اعظم
اسٹیم پریس حیدرآباد ۱۹۴۵ء)

ان حقائق سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس تصویر کا ایک دوسرا رُخ بھی تھا۔ ریاض شباب کی "امنگ و ترنگ" میں مشق سخن ہی تک محدود نہ رہ سکے۔ شاعرانہ تعلّی کی اور ایک دن اس حد تک آگے بڑھ گئے ؎

ہوتا ضرور معتقدِ حضرتِ ریاضؔ[۱] افسوس ہے یہی، اسد دہلوی نہیں

اور یہ صرف شاعرانہ تعلّی ہی نہیں تھی میرے نانا سید ناظر حسین ناظرؔ[۲] وکیل (وفات ۱۹۰۲ء) جو

---

[۱] میں نے اپنے مجموعہ مضامین "غالب نام آورم" (مطبوعہ سرفراز پریس لکھنؤ ۱۹۶۱ء) میں اپنی یادداشت پر اس شعر کا آخری مصرعہ لکھا تھا اور وہ بھی اس طرح پر (میں ہوں ریاض کچھ اسدِ دہلوی نہیں)۔ اصل گلدستہ جسمیں ریاض کی یہ غزل شائع ہوئی تھی برادرم سید رئیس احمد جعفری مرحوم کے پاس تھا جو ضائع ہو گیا۔ یہ مقطع میں نے اپنی ایک ڈائری میں نوٹ کر لیا تھا جو اب نقل کیا جا رہا ہے۔

[۲] اُس عہد میں سیتاپور میں۔ دو ناظر حسین ناظرؔ تھے ایک تو میرے نانا جو ایک ہمہ کار شخصیت کے مالک تھے۔ پُرگو سخن سنج۔ سخن فہم! جسٹس محمود مرحوم جو اس زمانے میں سیتاپور ہی میں بیرسٹری کرتے تھے اور ناظر کی وفات کے چند ہی ماہ بعد سیتاپور ہی میں وفات پائی انکے قانونی معاصرین میں تھے جن سے کافی نوک جھونک رہا کرتی تھی۔ میرے پاس ناظر کا ایک غیر مطبوعہ رسالہ ہے جسمیں انھوں نے جسٹس محمود کی "قانونی اردو" پر اعتراضات کیے ہیں۔ ناظر کا ایک نامکمل قلمی دیوان اور مراثی کا ذخیرہ بھی تا حال میرے یہاں محفوظ ہے۔ دوسرے "ناظر حسین ناظرؔ" سید رئیس احمد جعفری مرحوم کے والد ماجد تھے ۱۹۱۵ء میں وفات پائی اپنے خاندانی قبرستان "تکیہ فتن سرائے سیتاپور" میں آسودہ خواب ہیں۔ اسی قبرستان میں مومنؔ دہلوی کی اکلوتی صاحبزادی کی بھی قبر ہے جو مولوی عبدالغنی وکیل سیتاپور سے بیاہی گئی تھیں۔ (ناظم سیتاپوری)

ریاضؔ کے بے تکلف دوستوں میں تھے ان کا بیان ہے کہ ریاضؔ جب غالبؔ کے دیوان کا جواب لکھ رہے تھے انھوں نے ناظرؔ سے بھی اس کا تذکرہ کیا۔؟ ناظرؔ بڑے ہی بذلہ سنج اور بدیہہ گو شاعر تھے۔ بولے خوب ؟ آپ اور غالبؔ ۔ ؟ سبحان اللہ کیا کہنا۔؟

ناظرؔ کے کلرک منشی چنی لال وہیں قریب بیٹھے ہوئے مقدمات کی مثلیں ترتیب دے رہے تھے۔ ناظرؔ نے فی البدیہہ کہا۔

فلک کو دیکھتا ہوں، غالبؔ اور ریاضؔ احمد
خدا کی شان ہے ناظر حسین و چنّی لال،

جس زمانے کا یہ ذکر ہے اس دَور میں اساتذہ اور معاصرین کی زمینوں میں " جوابی دیوان" کہنے کا کافی رواج تھا فارسی اور اُردو کے صاحب دیوان شعراء کے دیوانوں کو سامنے رکھ کر انھیں بحروں میں قافیہ اور ردیف کے خاص التزام کے ساتھ بہت کچھ کہا گیا ہے جن کا ذکر جا بجا تذکروں میں ملتا ہے۔ دور کیوں جائیے خود لکھنؤ میں " آتشؔ و ناسخؔ " کی نوک جھونک اپنے شباب پر پہنچ کر اس کا شکار ہو گئی۔ ناسخؔ کو جب پتہ چلا کہ خواجہ آتشؔ ان کی زمینوں میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ اور ان کے " دیوان کا جواب" لکھ رہے ہیں تو آپے سے باہر ہو گئے " صاحبِ آبِ حیات" کا قول ہے کہ ناسخؔ نے اسی جھنجلاہٹ میں یہ مطلع کہہ ڈالا۔

ایک جاہل لکھ رہا ہے میرے دیوان کا جواب
" بوسَیلم " نے لکھا تھا جیسے قرآن کا جواب

خواجہ آتشؔ تک یہ مطلع پہنچا تو وہ آگ بگولا ہو گئے۔ ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

کیوں نہ دے ہر مومن اس ملحد کے دیوان کا جواب
جس نے دیوان اپنا ٹھہرایا ہے قرآن کا جواب

ریاضؔ نے بھی " دیوانِ غالبؔ " کو محض " مشق سخن " کے لئے منتخب نہیں کیا تھا بلکہ اس کے پس منظر میں بھی ایک " جوابی جذبہ " کار فرما تھا۔ سید عقیل احمد جعفری (نبیرۂ ریاضؔ) نے اسی جوابی دیوان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔

" حضرت ریاض اٹھارہ برس کی عمر میں دیوان غالب

کا "جواب" لکھ چکے تھے مگر کھلنڈرے پن کا حال یہ تھا کہ
جب ان کے والد مولوی طفیل احمد صاحب کے پاس ایک
"وفد" ان کی شکایت کرنے آیا تو وہ پائیں باغ میں اُس
کھیل میں لگے ہوئے تھے جو درختوں پر چڑھ کر کھیلا جاتا ہے۔
والد کے طلب کرنے پر کھیل کا میدان چھوڑ کر دیوان
خانے میں حاضرِ خدمت ہوئے والد نے بغیر کوئی سوال جواب
کئے یا تفصیل پوچھے۔ دیوان طلب کیا فوراً تعمیل کی گئی۔
ساتھ ہی حکم ہوا اسے انگیٹھی میں ڈال دو۔ اس کی بھی
تعمیل ہوئی ـــ!"

(صفحہ ۶۲۔ "امتیا نامہ" مطبوعہ اشرف پریس، لاہور)

حرف بحرف تو نہیں لیکن جناب عقیل جعفری کے اس بیان کی تائید حضرت اثیم خیرآبادی (جانشین آقائے سخن وسیم خیرآبادی) نے بھی کی ہے اپنے مکتوب گرامی میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"عم معظم حضرت ریاض نے جب دیوانِ غالب کے
"جواب" کی تکمیل فرمائی اور شدہ شدہ اس کی خبر حضرت
غالب تک پہنچی تو وہ کچھ کبیدہ خاطر ہوئے تعلقات دیرینہ
کی بنا پر شکایت پیدا ہوئی (یہاں پر میرا حافظہ پورا ساتھ
نہیں دے رہا ہے) کہ آیا حضرت غالبؔ بہ نفسِ نفیس
تشریف لائے یا کسی اور ذریعہ سے حضرت ریاض کے

لہ باوجودیکہ غالب اور مولانا فضلِ حق خیرآبادی میں نہایت ہی عزیزانہ اور مخلصانہ تعلقات تھے بلکہ بقول "صاحبِ آبِ حیات" مولانا ان کے "دلی دوست" تھے۔ اور ہر سال آم کی فصل میں خیرآباد (ضلع سیتاپور) آیا کرتے تھے اور غالب کو آم کا تحفہ بھی بھیجا کرتے تھے لیکن ان تعلقات کے بعد بھی کبھی غالب کا خیرآباد آنا کہیں سے ثابت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ غالبؔ کی اکلوتی بہن "چھوٹی خانم" کی تمام اولاد غدر سن ستاون کے بعد سیتاپور (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

والد جب خیرآباد تشریف لائے تو ریاض کو طلب فرمایا اور
حکم دیا کہ "جوابی غزلیات" کا مسودہ چاک کر کے نذرِ آتش
کر دیا جائے۔ حکم کی فوری تعمیل کی گئی۔"

ان دونوں "مستند روایات" سے یقیناً اس کی تائید ہوتی ہے کہ "دیوانِ غالب" کے جواب میں ریاض نے جو غزلیں کہی تھیں وہ "اوراق" نذرِ آتش کر دئے گئے۔ لیکن تخمیناً ایک صدی کے بعد ریاض خیرآبادی کے اس دیوان کا ایک مخطوطہ مجھے حضرت اثیم خیرآبادی کے ذخیرے میں دستیاب ہو گیا اور وہ بھی حیرت انگیز طریقے پر۔!

حضرت اثیم خیرآبادی برسہا برس سے خیرآباد کو خیرباد کہہ چکے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی کا بڑا حصّہ خیرآباد سے باہر گذرا لیکن ادھر مدتوں سے باہر تھے۔ خوش قسمتی سے چند ماہ ہوئے خیرآباد تشریف لائے۔ ملنے کے لئے گیا اور یہ وعدہ لے کر واپس آیا کہ اپنے خاندانی ذخیرے کے بچے کھچے حصّے کا جائزہ لے لیں۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۶۸ء کے آخری ہفتے میں جب میں اور برادرم سید محمد آفاق سیتاپوری (رئیس احمد جعفری کے بھانجے) خیرآباد پہنچے۔ تو حضرت اثیم نے نہایت ہی فراخدلی کے ساتھ وہ علمی ذخیرہ میرے سامنے ڈھیر کرا دیا جس کا بڑا حصّہ دیمک کی نذر ہو چکا تھا۔ آقائے سخن وسیم خیرآبادی کے بیشمار مسودات اور صدہا ادبی و خاندانی خطوط کچھ اچھی حالت میں کچھ دیمک خوردہ اس ڈھیر میں بکھرے ہوئے تھے یہاں تک کہ ایک بنڈل بہت ہی بوسیدہ حالت

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ہی میں یکجا ہو گئی کیونکہ غالب کے حقیقی بھانجے ڈپٹی عباس بیگ نے سیتاپور کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا تھا اور اسی ضلع میں انگریزوں نے انھیں "تعلقہ بڑا گاؤں" (تحصیل مصرکھ ضلع سیتاپور) جاگیر میں دے دیا تھا۔ ۱۸۶۳ء میں ڈپٹی عباس بیگ نے اپنی اکلوتی صاحبزادی "وجیہہ النساء" کی شادی اپنے حقیقی بھتیجے مرزا محمود بیگ (بن مرزا عاشور بیگ) کے ساتھ سیتاپور ہی میں کی تھی جس میں اودھ کے عمائدین اور اکابرین کے علاوہ ڈپٹی عباس بیگ کے تمام اعزہ شریک تھے سوائے مرزا غالب کے، غالب نے اس شادی میں عدم شرکت کا افسوس قدر بلگرامی کے نام ایک خط میں بھی کیا ہے اور مرزا محمود بیگ کے نام ایک خط میں بھی اس کا ذکر ہے۔ بہرحال غالب نہ کبھی سیتاپور آئے اور نہ خیرآباد پہنچ سکے۔ (نادم سیتاپوری)

میں ایسا ملا جس کے گرد و پیش تمام اوراق ہاتھ لگاتے ہی زمین پر آرہے! لیکن میں ناامید نہ ہوا مسلسل کریدتا ہی رہا میری خوش نصیبی میری جد وجہد کی معین کار تھی چنانچہ تہ در تہ اس میں دو ایسے جواہر پارے مل گئے جو بہت حد تک اچھی حالت میں ہیں۔ ایک تو "امیر اللغات" کے ناتمام مسودے کے اوراق۔ دوسرے ریاض کے قلم کا لکھا ہوا یہ دیوان! جس کے یہ خدوخال "پہلی بار" پیش کئے جا رہے ہیں۔ حضرت اثیم خیرآبادی بھی ان اوراق کو بھلا چکے تھے۔ میرے یاد دلانے پر چونک سے پڑے۔ فرمایا:؟

"ہاں — یہ خوب ملے! آخر عمر میں جب یہ دیوان حضرتِ
ریاض کو بالکل اتفاقیہ طور پر دستیاب ہوا تو خوشی میں
بہ نفس نفیس غریب خانے پر تشریف لائے۔ اور فرمایا کہ
اس کا اہل تم سے زیادہ کون ہوگا۔ اپنے پاس محفوظ کر لو
اور یہ بھی ارشاد فرمایا کہ یہ میرے "عنفوان شباب" سولہ[۱۶]
سے بیس[۲۰] سال کی مشق سخن ہے۔"

یہ دیوان بادامی کاغذ کے تخمیناً سو صفحات پر مشتمل ہے۔ کچھ ابتدائی اوراق تلف ہو چکے ہیں اور چند درمیانی صفحات بھی ضائع ہو گئے ہیں۔ تقریباً نصف حصہ خطِ شکست میں ہے اور باقی اوراق خوشخط سیاہ روشنائی سے تحریر ہیں۔ بعض غزلیں اور ابیات ابتدائی حصہ میں شکستہ خط میں بھی ہیں اور پھر انھیں دوبارہ خوشخط بھی لکھا گیا ہے۔ دیوان کا ابتدائی حصہ مسودہ کی شکل میں ہے جا بجا اشعار قلم زد کئے گئے ہیں۔ اور اصلاحیں بھی موجود ہیں۔ مگر یہ تمام اوراق از اوّل تا آخر خود ریاض کے لکھے ہوئے ہیں۔ آخر عمر میں مَیں نے ریاض کو قریب سے دیکھا بھی ہے اور خط وکتابت بھی رہ چکی ہے (اس سلسلے کے چند خطوط "نقوش" کے خطوط نمبر میں شائع ہو چکے ہیں) میں ریاض کی تحریر پہچانتا ہوں اور ان اوراق کے بارے میں پورے یقین اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ جتنے اوراق بھی اس مخطوطے میں شامل ہیں۔ ان کا لفظ لفظ ریاض کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی تصدیق حضرت اثیم خیرآبادی نے بھی کی ہے اور اس کے بعد اب کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

مخطوطہ کی لمبائی گیارہ" انچ اور چوڑائی ساڑھے آٹھ انچ ہے۔

ریاض کا سنِ ولادت ۱۸۵۳ء ہے اور غالب کا سن وفات ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء۔ اور ریاض کے خود نوشت حالات سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے مولوی نبی بخش کے مدرسۂ عربیہ کو اوائلِ عمر میں ہی خیرباد کہہ دیا تھا میرا قیاس ہے کہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں وہ شعر و سخن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے اور "دیوانِ غالب" کا یہ جواب ان کی بالکل نوعمری کی "ترنگ" ہے۔ عقیل جعفری کا یہ بیان محل نظر ہے کہ انھوں نے اٹھارہ سال کی عمر میں دیوانِ غالب کا جواب کہا تھا۔ مقامی روایات سے اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ یہ دیوان ریاض نے غالب کی زندگی ہی میں کہا تھا اور بقول انکے "مشقِ سخن" تک محدود تھا۔ کیونکہ اسی مخطوطے میں غالب کی ایک ہم طرح غزل میں ریاض کا یہ شعر بھی ملتا ہے جو کسی سنجیدہ روی کا ترجمان نہیں کہا جا سکتا۔

غالب و مومن و سودا کیسے
لوگ چرکیں کی ہوا باندھتے ہیں

اسی طرح کا ایک دوسرا شعر بھی اس دیوان میں موجود ہے۔

غالب نے "نگے" ہیں شعر آخر
واللہ۔ گس کی قے نہیں ہے

یہی نہیں۔؟ اسیر اور امیر کے حلقۂ تلمذ میں شامل ہونے کے بعد "ناپختہ کار شعور" نے عنفوانِ شباب کی "ترنگ" میں انھیں حدود سے کچھ اور بھی آگے بڑھا دیا تھا۔ کہتے ہیں۔

ابتو استادِ زمانہ ہیں اسیر اور امیر
ان کے پائے کے کبھی "مصحفی و میر" نہیں

یقیناً ریاض اس سے بے خبر نہیں تھے کہ اسیر اور امیر دونوں بوستان مصحفی کے خوشہ چیں تھے۔ لیکن اس "بے راہ روی" کی ذمہ داری ریاض سے زیادہ اس ماحول پر عائد ہوتی ہے جس نے لکھنؤ اور دلی کے لسانی جھگڑوں کو اتنا بڑھا دیا تھا کہ لکھنؤ میں دلی کے مصرعہ پر گرہ بھی لگائی جاتی تھی تو اس انداز کی ؎

سُنا ہے کہ دلی میں الو کے پٹھے رگِ گل سے بُلبل کے پر باندھتے ہیں

ریاضؔ بلاشبہ اسی "لکھنؤ اسکول" سے تعلق رکھتے تھے اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اسی عہد میں ریاضؔ کے وطن خیرآباد کی دو طوائفیں[۱] زہرہ و مشتری غالبؔ کی حریف بن کر سامنے آگئیں۔ "اودھ اخبار" (لکھنؤ) کے پرانے اخباری فائل اب کمیاب ہوچکے ہیں۔ اس لئے ان ادبی ہنگاموں کے بارے میں تفصیل کے ساتھ کچھ نہیں کہا جاسکتا البتہ جناب مالک رام نے "ذکرِ غالبؔ" کے ایک فٹ نوٹ میں اتنا ضرور لکھا ہے۔

"اسی دوران میں میر آغا علی شمسؔ لکھنوی نے "اودھ اخبار" (لکھنؤ) ۲۵ جون ۱۸۶۷ء میں ایک مضمون لکھا جس میں مرزا (غالبؔ) کے بعض اشعار پر اعتراض کئے تھے اس کا جواب سخن (خواجہ فخرالدین) نے اردو نثر میں اور باقرؔ نے فارسی نثر میں لکھا"

(صفحہ ۱۸۱-۱۸۲، ذکرِ غالب تیسرا ایڈیشن)

صاحب تذکرہ "خم خانۂ جاوید" کا بیان ہے۔

"انھیں دنوں میں آپ (آغا علی شمس) نے بھی مرزا (غالبؔ) کے خلاف اخباروں میں زہرہؔ و مشتریؔ کے نام سے مضامین شائع کئے تھے اور میرزا صاحب (غالبؔ) کی شاعری پر بھی کچھ اعتراضات کئے تھے مگر چاند پر خاک ڈالنے سے کیا ہوتا ہے"

(صفحہ ۳۶- تذکرہ خمخانہ جاوید جلد پنجم)

ان دونوں حوالوں سے اس عہد کی پوری عکاسی ہوتی ہے جب "لکھنؤ" "غالب" نہیں پورے "دلّی اسکول" کے مقابلے میں کھل کر سامنے آچکا تھا۔ ریاضؔ کا شعری شعور اسی عہد کی پیداوار تھا جس کا ماحول سے متاثر ہونا غیر فطری نہیں تھا قرائن یہ بتاتے ہیں کہ اس زمانے میں

---

[۱] ملاحظہ ہو "غالب نام آورم" (شائع کردہ ادارۂ فروغِ اُردو لکھنؤ) میں میرا مضمون "غالب کی حریف زہرہ و مشتری"! نادم سیتاپوری۔

ایسے غالب پسندوں کی اس طرف کوئی کمی نہیں تھی جن کی " اصابت رائے" کو حیرت و استعجاب کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں ریاض اور غالب کے پرستاروں میں کوئی ایسی ہنگامہ خیز ادبی جنگ ہوئی تھی جو " دیوانِ غالب کا" جواب" بن کر سامنے آگئی۔ ریاض نے اسی دیوان میں ایک جگہ اس کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

مرگِ غالب پا گیا اتمام جیسے اے ریاض
کوستے ہیں مستفیضِ میرزا صاحب مجھے

دوسرے مقطع میں ہے۔

کیوں زور دے رہے ہو طبیعت کو اے ریاض
انصاف سے ہے حصۂ غالب عتاب میں

غالب کے مروجہ دیوان کی ردیف " الف" میں تخمیناً پینتیس ۳۵ مکمل و نامکمل غزلیں ایسی ہیں جن کی ہم طرح غزلیں ریاض کے اس مسودے میں نہیں ہیں۔ کیونکہ اس کے ابتدائی اوراق ضائع ہو گئے ہیں۔ آخری حصہ بہت حد تک مکمل ہے اور خاتمہ دیوان پر صرف اس قدر لکھا ہے۔

" بفضلِ یزداں ایں دیوان بہ پایاں رسید"

آخری غزل جو اس مخطوطہ میں ہے اس کا مقطع ہے ؎

ریاض اس کے خد و خال کی جو کی تعریف
ہر ایک حرف ہے دیوان نکتہ داں کے لئے

درمیانی صفحات میں حاشیہ پر ریاض کا ایک فارسی رقعہ " رقعہ بنام مشاعرہ ایٹہ" اور ایک اردو غزل بھی ہے جو ان کی فارسی انشاپردازی پر تاریخی روشنی پڑتی ہے۔

اے[1] خوش نشان بزم سخن دے گر غایگان نادر فن اندیشہ
طومار نیرنگ ایں یادہ سرا نتق بستہ جا لیست ہر ہفت
کردہ شوخی سلسلہ مویاں پیچیدہ کاکل بہ اندازہ خود ستائی

---

[1] بعض جگہ پڑھا نہیں گیا۔

بر باد داده حسن تازہ سرشت بعد موجہ پالائے مذی مل یانہ
عزالیست بہ سامان خس لب افسون نخوانان نہ دام
بدر جبیستگی را عنان رم دادہ راز مطالب بر رو کشادہ
در شگفت جلوہ گل نے نے خود گلیست فریب خوردہ
فسون عندلیبان ریختہ دامان از تنگ بل از نقش
تمثال نقاش چاک زدہ جیب و گریبان باختہ بوئے ورنگ
اوخ اوخ کز نگارستن شمع را فروغ لالہ را داغ گل را
رنگ میکدہ را چراغِ موسیٰ نگہان را تجلیِ طور یکتا
گریبان اپردہ حور صفحہ را سر بسر سودائے سویدا آمد رنگ
ہویدا از خم زانا خن خار را بن پروانہ را سوز و ساز
شمع را گداز دشنہ را جگر گلو را خنجر۔ چشم را تغافل و ناز
حسن را طرز و انداز دل را بیقراری دیدہ زاری۔ آہ را
ثر و را گذار زانی داشتہ ریاض خستہ را بہ نظم و نثر ادائے
تازہ و ہمنفتان را رشک بے اندازہ بخشید۔ ہلا المعانی
آواز شناخیم بہ پر افشانی زبانہ شمع سخن ایٹہ۔ ۱۲
کہ تنویرش از مہر و ماہ برخاستہ ہیجان ....
.. سودائے را سر بسر..... تازہ نشان کرد۔ اے دائے
بعنوان کہ سرم داشت ہوائے۔ پژمردہ گلی بود رخنہ
شرر برق بر شگفتا.... کہ سرمستان ز حسن رشک سخن
بغایت بیہوشی در بنولہ نیفازہ زنی خردہ گرفتن آغاز
نہند نخواہم۔ ہر چند زمانہ مجمع جہاں است۔ در جہل
ز حال شان بہ یک سوال است کو دن ہمہ لیک از یکے
نادگرے۔ فرق خرِ عیسیٰ و خر دجال است۔ ہاں ز حرف

نگہاں والا ہنر ایں وژم طالع وژند اختر۔ گرچہ ناخواندہ
مہمان بشما است۔ سخن ریزہ چیں خواں شما است —
ایں نہ گویند ماجرائے رخت۔ از نو در گفتگو خطائے رفت"

والسلام، ناتمام

اسی حاشیے پر "غزل ایضاً" کے تحت پوری غزل دی گئی ہے جو درج ذیل ہے۔

چمکے اے بخت سیہ داغ سویدا میرا — رنگِ صد لالۂ بے داغ ہو سودا میرا
آمدِ جوشِ جنوں وحشتِ کامل مت پوچھ — تازہ ہوتا ہی نہیں سر سے یہ سودا میرا
خارِ صحرائے جنوں ذوق و تمنا افزوں — پھر کھجاتا ہے کئی دن سے یہ تلوا میرا
ریزشِ خونِ جگر جوہرِ تیغ قاتل — لطف صد زخم بہ موجِ خمِ صہبا میرا
مرگئی "بلبلِ بیدل" بہ نوائے دلکش — نوحۂ غم سے بڑھا نغمۂ تازہ میرا
نگہِ ناز جو منظورِ نظر کر لیوے — سُرمۂ چشم بنے داغ سویدا میرا
سخت جانی سے رکا ہاتھ مرے قاتل کا — نہ کھلا ناخنِ شمشیر سے عقدہ میرا
ایک عالم تہ و بالا ہوئے دشمن روئے — کل اُٹھایا مرے قاتل نے جو لاشہ میرا
برقِ نظارہ طپیدن بہ تمنا افسوس — کوئی ایسا نہیں دیکھے جو تماشا میرا
میرے مرنے کا سُنا حال تو بولا قاتل — ہائے وہ عاشق و شیدائی و رسوا میرا
آبِ خنجر سے چمن زخم کا سینچا قاتل — خوب سرسبز کیا نخلِ تمنا میرا
بعد مردن ہی نکل جائے یہ حسرت دل سے — لے چلو کوچۂ قاتل سے جنازہ میرا
کیا کروں لکھ کے قصائد بہ زمینِ غالبؔ — ایک دیوان کے لکھنے سے ہے شہرہ میرا

جان دیتے بھی ریاضؔ اب نہیں بن پڑتی ہے
پڑ گیا کس بتِ بے رحم سے پالا میرا

اس غزل کے دو ایک بالکل معمولی شعر نظر انداز کر دئے ہیں۔ سرِ مقطع شعر سے اس مخطوطے کی شہرت پر روشنی پڑتی ہے جو اس زمانے میں اس جوابی دیوان کو حاصل ہو چکی تھی۔

کیا کروں لکھ کے قصائد بہ زمینِ غالبؔ — ایک دیوان کے لکھنے سے ہے شہرہ میرا

عکسِ تحریر، ریاضؔ خیرآبادی

ضعفِ عشق دیدۂ تر یاد آیا
دمِ لبِ تو نیم رہِ یاد آیا

خاک ہو کر بھی ٹھکانا ہے یہاں
وہ جو ہنگامِ سفر یاد آیا

وائے صد کرب پیکانِ مژہ
پھر تماشائے نظر یاد آیا

دیکھ کر جوہرِ خنجر کی چمک
عمر کا راہگذر یاد آیا

اے خوشا طالعِ خسرو نقش
نیشِ مژگاں کو جگر یاد آیا

دل تھا پھر طالبِ مژگانِ کسی
صدمۂ زخمِ جگر یاد آیا

چشمِ تر نے جو دکھایا طوفاں
سوئے میخانہ چلا تھا واعظ

دیوان حروف تہجی کے حساب سے ہے جس قدر پڑھا جا سکا اس کی ترتیب وار فہرست معہ اشعار درج ذیل ہے البتہ کچھ فردیات اس میں شامل نہیں ہیں جو یا تو کرم خوردہ ہیں۔ یا اتنی شکست کہ ابھی تک میں انھیں قرائن سے بھی پڑھ نہیں سکا:۔

۱۔ مطلع نہیں ہے۔ پہلا شعر یہ ہے ؎

شمشاد جھکا جاتا ہے کیو شرم کے مارے　　　کیا سرو قدی میں یہ برابر نہ ہوا تھا

۲۔ جبکہ وہ پردہ نشینِ حلقۂ ناموس تھا　　　تعداد اشعار۔ ۳

۳۔ مطلع نہیں ہے۔ پہلا شعر ہے ؎

بعد از فنا وہ طعمۂ زاغ و زغن ہوئے　　　عمر دو روزہ پر جنھیں بیجا غرور تھا

تعداد اشعار۔ ۳

۴۔ مشقِ خرام ناز کے قابل نہیں رہا　　　تعداد اشعار۔ ۵

۵۔ مطلع نہیں ہے۔ پہلا شعر!

بلبل و پروانہ سوزاں (ہی) کے دل سے پوچھیے　　　اس رقابت سے ہوا گلگیر کس کا آشنا

تعداد اشعار۔ ۷

۶۔ صرف ایک مطلع ہے ؎

جوش طوفانِ بلا دیدۂ گریاں میرا
آتشِ برق فگن نالۂ سوزاں میرا　　　تعداد اشعار۔ ۱

۷۔ مطلع نہیں ہے۔ صرف دو شعر ہیں ؎

نسیم ناز وجہ دل شگفتن سر بسر یعنی
ہوائے گل ہے کھلنا غنچہ باد بہاری کا　　　تعداد اشعار۔ ۲

۸۔ مطلع نہیں ہے۔ پہلا شعر۔ ! ؎

پامالی خرام میں آتشِ زدہ نہیں،
خس پوش ہے مگر ابھی شعلہ گیاہ کا　　　تعداد اشعار۔ ۵

۹۔ صورت زلیست ہے جینے میں فنا ہو جانا — تعداد اشعار۔ ۱۳

۱۰۔ لخت دل خوں ہیں جو ہو بال کشا موج شراب — تعداد اشعار۔ ۷

۱۱۔ صرف دو شعر ہیں۔ پہلا شعر ہے

بر عکس حنا سادگی حسنِ صفا سے
بنتے صدفِ کف میں ہیں عقدِ گہر انگشت

۱۲۔ یہ آنکھیں ہیں گرتا قیامت سلامت — تعداد اشعار۔ ۳

۱۳۔ صرف ایک شعر ہے

قسمیں یوں کھاتے ہو گر دیدہ تصویر سے تم
کام آؤگے مرے، مجھکو یقین پر کس وقت

۱۴۔ دیکھنا ہو جس کو دیکھے گرمی بازار دوست — (نامکمل غزل)

۱۵۔ قدم نہ جادۂ بزم طرب سے باہر کھینچ — تعداد اشعار۔ ۷

۱۶۔ طرز و اندازِ تغافل نہ چھٹا میرے بعد — (نامکمل)

۱۷۔ سر فروغ یوسفستان پھر ہوا بازار دوست — تعداد اشعار۔ ۱۲

۱۸۔ کیوں سہے گا یہ کوئی جور و جفا میرے بعد — تعداد اشعار۔ ۶

۱۹۔ کاغذ شکستہ ہے۔ مطلع پڑھا نہیں گیا۔ پہلا شعر ہے

بہ سیل گریہ شکایت ہے سرگرانی کی،
تلاش کرتے ہیں ہم دربدر در و دیوار — تعداد اشعار۔ ۱۰

۲۰۔ بولا نہ طوطی اپنا رُخِ یار دیکھ کر — تعداد اشعار۔ ۱۲

۲۱۔ فلک آنکھوں سے لیتا ہے شعاعِ مہر رخشاں پر — تعداد اشعار۔ ۱۲

۲۲۔ بسیرا طائرِ دل نے کیا ہے تیغ جاناں پر — تعداد اشعار۔ ۸

۲۳۔ مطلع نہیں ہے۔ پہلا شعر ہے

کیا ہے سرخرو خنجر نے مجھ کو دست قاتل سے
رہیگا تا قیامت بارِ احساں میری گردن پر — تعداد اشعار۔ ۶

۲۴- دو شعر ہیں - پہلا شعر ؎

دست جنوں مدد کہ پس از مرگ دوش پر
بارِ گراں ہے ضعف سے تارِ کفن ہنوز ، تعداد اشعار - ۲

۲۵- وہ برقِ ناز کبھی ہو جو گرم ناز و نیاز تعداد اشعار - ۶

۲۶- چار شعر کی نامکمل غزل - ایک شعر یہ ہے ؎

شکست رنگ عاشق غازۂ معشوق کی تزئین
نسیم آہ بلبل خندہ گل ہائے گلستاں پر

۲۷- نشاطِ شوق حریفِ حصول پردہ ساز تعداد اشعار - ۱۳

۲۸- برق دش ہے جو وہی گرمی بازار ہنوز تعداد اشعار - ۹

۲۹- چلتا ہے مرے دم سے یہ رستا کوئی دن اور تعداد اشعار - ۱۳

۳۰- کفر مجھ کو ہے مری جانِ عزیز تعداد اشعار - ۱۱

۳۱- گل نہیں چاک قبا کا انداز تعداد اشعار - ۸

۳۲- تجھکو اے عندلیب قتلِ وفائے گل تعداد اشعار - ۱۱

۳۳- صرف دو شعر ہیں ؎

کس کے دل پر خون سے بہ نکلا شرارہ
دوزخ میں ہوئی جاتی ہے جو مضمحل آتش

۳۴- کس قدر یارب ہوئے صرف غم پروانہ ہم تعداد اشعار - ۵

۳۵- صرف ایک شعر ؎

سپاسِ سنگ کہاں تک کہ بعد مردن بھی
شکست شیشۂ دل کی نہیں صدا معلوم

۳۶- دو شعر ؎

سر نذرِ دلفریبیٔ قاتل بہ سیم و زر
خنجر کے ہاتھ ہے مری اس بیکسی کی شرم

۳۷- ایک شعر ؎

خوں نابہ جگر کا تمسک تو چاک ہو
آتا ہے دل میں قرضہ مژگاں ادا کروں

۳۸- ہجر میں لذتِ وصال کہاں -؟ تعداد اشعار - ۶

۳۹- نازو انداز کو سب جور و جفا کہتے ہیں تعداد اشعار - ۱۶

۴۰- یاد میں اس جلوۂ گل کے - کہ گلشن میں نہیں (۱۲ - شعر)

۴۱- اپنے کیے کی شرم سے کیا کیا گماں نہیں (۱۲ - شعر)

۴۲- مطلع نہیں ہے - پہلا شعر ہے ؎

آتا ہے دل میں دیکھ کے خونریزیٔ جگر
تیری نگاہِ ناز کو تیغِ قضا کہوں ، تعداد اشعار ۴

۴۳- ہے ارادہ کر کے ترکِ مے پرستی ایک دن (۶ - شعر)

۴۴- اے جنوں چھٹنے کی اس سے کوئی تدبیر نہیں (۱۰ - شعر)

۴۵- برہمن بت سے تو اُمید نہیں (۷ - شعر)

۴۶- ہے خواب مرگ ہم کو اسی پیچ و تاب میں (۳۲ - شعر)

۴۷- دو شعر ؎

طوق قمری سے بڑھی آزادیٔ رنگِ خیال
سرو قد کی یاد میں دل ہے گرفتارِ چمن ،

۴۸- گلستاں میں نقشِ قدم دیکھتے ہیں (۶ - شعر)

۴۹- چشمِ بد دور لگاوٹ انھیں منظور نہیں (۹ - شعر)

۵۰- حسرتِ ناز نگاہِ ستم ایجاد نہیں (۱۳ - شعر)

۵۱- لختِ جگر کا رنگ ہے موجِ شراب میں (۱۲ - شعر)

۵۲- آہ بلبل کو صبا باندھتے ہیں (۸ - شعر)

۵۳- نُو شعر کی غزل ہے - ایک شعر ؎

دشوار ہو گئی ہے جو آسانیٔ وصال
آساں یہ ہو گیا ہے کہ دشوار بھی نہیں

۵۴۔ بنے ہیں ریزۂ الماس اپنے استخواں تن میں (۱۰۔شعر)

۵۵۔ سوائے آب کے آتش نظر میں خاک نہیں (۷۔شعر)

۵۶ کبھی جو ہم دل زار و جگر کو دیکھتے ہیں (۱۴۔شعر)

۵۷۔ گیارہ شعر کی غزل۔ ایک شعر یہ ہے ؎

تیر نگاہ ناز سے کرتے ہیں خون کس طرح
سن کے اوا و ناز سے، ناز سے دیکھنا کیوں

۵۸۔ تماشا ہوں دل خوں گشت، اگر گرم تماشا ہو (۲۔شعر)

۵۹۔ دل میں ہمارے ان کی محبت ہی کیوں نہ ہو (۹۔شعر)

۶۰۔ دس شعر کی غزل ہے ایک شعر یہ ہے۔

دھوکا ہوا تھا کفچۂ افعیٔ زلف کا،
چوے لپٹ کے جادہ سے جو راہزن کے پاؤں

۶۱۔ مطلع نہیں ہے پہلا شعر یہ ہے ؎

آتشِ افعیٔ کاکل کے چمن کھلنے سے
داغِ طاؤس جگر باغ ارم ہے ہم کو (۸۔شعر)

۶۲۔ کیجئے کیا اس جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو۔ (۳۔شعر)

۶۳۔ صرف ایک بیت ؎

پرتو سے حسنِ یار کے اب دل ہے آئینہ
طوطی سے آئینے کے مقابل ہے آئینہ،

۶۴۔ دو شعر ہیں۔ ایک یہ ہے ؎

جلوہ ہے درد و یاس کا راہ عدم کے ساتھ
بیگانگیٔ خلق و غمِ مہرباں نہ پوچھ

۶۵۔ کیوں ہم کہیں کسی سے کہ مژگاں اٹھائیے (۱۱۔ شعر)
۶۶۔ کا ہے کو نشترِ غمِ مژگاں اٹھائیے (۹۔ شعر)
۶۷۔ عالم پہ آج جوششِ طوفاں اٹھائیے (۹۔ شعر)
۶۸۔ رہنے کو میرے کوئی خرابات چاہیے (۹۔ شعر)
۶۹۔ رہا تھا ایک دل باقی برائے نامِ خوں۔ وہ بھی (۷۔ شعر)
۷۰۔ نکلا دمِ آخر نہ سخن کوئی لبوں سے (۴۔ شعر)
۷۱۔ بحمد اللہ ہوئی زانو سے فرصت سر اٹھانے کی (۸۔ شعر)
۷۲۔ وحشت سے تنگ ہو گیا سارا جہان ہے (۷۔ شعر)
۷۳۔ روز افزوں ہے ہماری بیقراری ہائے ہائے (۱۳۔ شعر)
۷۴۔ دل پر ہجوم حسرت و اندوہ و یاس ہے (۶۔ شعر)
۷۵۔ دردِ غمِ فراق سے یہ اپنا حال ہے (۷۔ شعر)
۷۶۔ چشمِ جاناں تو ادھر اور دل ادھر بیمار ہے (۷۔ شعر)
۷۷۔ خیالِ حلقۂ کاکل اسیری کی تمنا ہے (۵۔ شعر)
۷۸۔ عشق کا کل نہیں وحشت ہی سہی (۱۲۔ شعر)
۷۹۔ شعلۂ آہ اک آفت ہی سہی (۱۱۔ شعر)
۸۰۔ اے سیل اشک شورشِ دل ہے بچا مجھے (۵۔ شعر)
۸۱۔ شبہائے ہجر سے ہمیں کیا اضطراب ہے (۷۔ شعر)
۸۲۔ یاں ادائے ناز پر مرنے کی حسرت دل میں ہے (۸۔ شعر)
۸۳۔ بجلی سی دفعتاً سر و پا سے اتر گئی (۱۰۔ شعر)
۸۴۔ پھر وہی دل کو بیقراری ہے (۱۴۔ شعر)
۸۵۔ آمدِ فصلِ لالہ زاری ہے (۱۱۔ شعر)
۸۶۔ نہ کیوں ہو سرخروئی باعث اپنی شادمانی کی (۸۔ شعر)
۸۷۔ جا کر اسیرِ گیسوئے خمدار ہم ہوئے (۱۱۔ شعر)

۸۸- ہر عکس وحشیان خوبہ جوش وخروش ہے (۱۴-شعر)

۸۹- پہلو میں وہ دل بیقرار نہیں ہے (۲- شعر)

۹۰- بھلا کیا ناخن مژگاں کو اس کاکل سے حاصل ہے (۳- شعر)

۹۱- تین شعر ہیں مطلع نہیں ہے ؎

کیوں مرا آماجگاہِ تیر حسرت دل بنے
گر خدنگ ناز کا کر دے اشارہ تو مجھے

۹۲- حالت ترے وحشی کی جو گفتار میں آوے (۱۲-شعر)

۹۳- زخم سے دل کو نہیں ہوتی تسلی نہ سہی (۸- شعر)

۹۴- نگارش ہائے کلک فکر اپنا عرش عالی ہے (۲- شعر)

۹۵- نشاط ضعف سے ہوئینگے سب میں ہم آگے (۷- شعر)

۹۶- قیس و فرہاد کہانی میری (۹- شعر)

۹۷- مطلع نہیں ہے۔تین شعر ہیں ؎

داغ طاؤس جگر نازشِ بہزاد بنے
مارِ کلکِ دوزبان صورت مانی مانگے

۹۸- نکہت تری کاکل کی سر میں جو سمائی ہے (۳- شعر)

۹۹- سوجھی ہے انھیں نزع میں تدبیر رفو کی (۷- شعر)

۱۰۰- کیسے نہ چرخ پر ہنیں اختر شرار کے

۱۰۱- گیارہ شعر۔ایک شعر یہ ہے ؎

برقِ نازِ شعلہ روپائے جہاں
طور دلبر جلوہ آرا چاہیے،

۱۰۲- رونقِ خانۂ مجنوں ہے نمایاں مجھ سے (۱۴-شعر)

۱۰۳- وحشی زلفِ رسا گر تنگ عریانی کرے (۵-شعر)

۱۰۴- وہ برق کش مجھے تعویذ اضطراب تو دے (۵- شعر)

۱۰۵- در غلطاں سے یہاں سلک مسلسل تار بستر ہے (۶- شعر)

۱۰۶- دل میں مرے کوئی لَے نہیں ہے (۷- شعر)

۱۰۷- دم شمشیر صد ذوق رگ گردن نہ ہو جائے (۲- شعر)

۱۰۸- مطلع نہیں ہے صرف دو شعر ہیں۔ پہلا شعر! ؎

ہے اپنا قطرہ پر خون موجۂ طوفاں
کہ دجلہ دیدۂ پرنم کا بحرِ اعظم ہے

۱۰۹- مطلع نہیں ہے چار شعر ہیں۔ ایک شعر یہ ہے ؎

خدا کے واسطے چل شعلۂ شرر افشاں
کہ گوش پنبہ دہاں آج پنبہ آگیں ہے

۱۱۰- مرنے کو بھی میرے وہ گوارا نہیں کرتے (۳- شعر)

۱۱۱- اس لیے رہتا ہے تنگ دامن افشانی مجھے (۱۰- شعر)

۱۱۲- ہوں مریض شوق از بس موت دے یارب مجھے (۵- شعر)

۱۱۳- مطلع کا پہلا مصرع کرم خوردہ ہے دوسرا مصرعہ یہ ہے (۹- شعر)

ع تو شوخی سے نگاہ ناز شرما جائے ہے مجھ سے

۱۱۴- مطلع کا مصرعۂ اولیٰ ادھورا ہے۔ دوسرا مصرعہ!

ع گلو کو خنجرِ براں سے کیوں ندامت ہے (۴- شعر)

۱۱۵- دزدیدگی نگاہ کی بیباک ہو گئی (۷- شعر)

۱۱۶- مطلع نہیں ہے پہلا شعر ہے ؎

داغہا ہمرنگ گلشن، نالہا آہنگ دل
آہِ سرد چشم پر خوں جوئبار نغمہ ہے

۱۱۷- صیقل آئینہ پہلو متاع جلوہ ہے (۲- شعر)

۱۱۸ گلشن زخم دل رنگیں برائے خندہ ہے (۶- شعر)

۱۱۹۔ کیوں درد دل کو آپ سے پیدا کرے کوئی (۱۴۔شعر)

۱۲۰۔ مطلع کا پہلا مصرعہ پڑھا نہیں گیا۔ دوسرا مصرعہ یہ ہے!

ع تارجان چاک گریباں نظر آتا ہے مجھے (۵۔شعر)

۱۲۱۔ گوش گل میں شور بلبل کی صدا ہو جائے (۲۔شعر)

۱۲۲۔ خار مژہ سے آبلۂ دل ہلاک ہے (۳۔شعر)

۱۲۳۔ مطلع نہیں ہے پہلا شعر ہے ؎

کیوں نہ سنگ راہ ہووے لذتِ سودائے میر

سلسلہ زلفِ رسا کا پاؤں میں ہے جادہ سے (۲۔شعر)

۱۲۴۔ تماشا ہے کہ ہر لخت جگر صد شور و افغاں ہے (۵۔شعر)

۱۲۵۔ نیاز و ناز میں طرفہ ادا نکلتی ہے (۴۔شعر)

۱۲۶۔ سر میں سمائی نکہت گیسوئے یار ہے (۱۰۔شعر)

۱۲۷۔ پھر دل سے سوز ہجر میں اُٹھا بخار ہے (۹۔شعر)

۱۲۸۔ سات شعر کی غزل میں مصرعہ اولیٰ کئی جگہ ضائع ہو گئے ہیں۔ ایک شعر یہ ہے ؎

موئے مژہ ہیں موجزن دل کہ خون رنگ

کسب فروغ بادہ سے مینا کہیں جسے

۱۲۹۔ عالم سے نرالا ترا انداز ادا ہے (۱۲۔شعر)

۱۳۰۔ ہے چشم تر جو خاطر مہماں کیے ہوئے (۲۰۔شعر)

۱۳۱۔ قدم جو سر پہ بصد شوق جان جاں کے لئے (۱۵۔شعر)

ذیل میں اس نایاب مخطوطے کا ایک سرسری انتخاب پیش کر رہا ہوں۔ اس انتخاب میں حتی الامکان میں نے یہی کوشش کی ہے کہ زیادہ تر ایسے ہی اشعار پیش کیے جائیں جو غالب کے رنگ میں کہے گئے ہیں۔ یہ انتخاب "سرسری" ہے اگر اس دیوان کے چھپنے کی نوبت آگئی تو اربابِ نظر یقیناً اس سے اچھا انتخاب کریں گے۔

یہ نادر و نایاب مخطوط جو کم و بیش ایک صدی کے بعد سامنے آرہا ہے نہ محض سلسلہ

غالبیات کی ایک اہم تاریخی کڑی ہے بلکہ ریاض خیرآبادی کی ابتدائے فکر سخن کا ایسا گراں بہا سرمایہ ہے جو اُردو شعروادب کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کرے گا۔

اک حشر بجنونِ ہمہ عالم ہے کہ اب تک ۔۔۔ رنگین بہ حنا فتنہ محشر نہوا تھا
پانی میں ریاض آگ لگی دیدہ تر سے ۔۔۔ آذر کدہ داغ سمندر نہوا تھا

واں عناں گیر ترحم عجز مطلب اور یاں ۔۔۔ نعل در آتش شمستہ حسرت پابوس تھا

مشقِ خرام ناز کے قابل نہیں رہا ۔۔۔ جس دل سے بے نیاز تھا وہ دل نہیں رہا

تھی نگاہ ناز صد سامان طراز خون دل ۔۔۔ موجۂ صہبا جو ہو یک قطرہ دریا۔ آشنا
نقش کن آئینہ تمثال ہو شاید ریاض ۔۔۔ پر نہیں اس عالم تکوین میں پیدا۔ آشنا

جوش طوفانِ بلا دیدۂ گریاں میرا ۔۔۔ آتش برق فگن نالہ سوزاں میرا

منت کش غیر نہیں فیضِ عشق سے ۔۔۔ دشت جنوں میں خضر ہے جادہ نگاہ کا

جادۂ زخم جگر ہے خلشِ مژگاں سے ۔۔۔ ایک ناخن گرہ زخم کا وا ہو جانا
کاوشیں ناوک مژگاں کی اٹھاؤں کب تک ۔۔۔ آرزو ہے دلِ پُرخوں کا فنا ہو جانا

نشۂ شوق صدا آرا میں ہیں سرمست چمن ۔۔۔ بوئے گل، شیشہ دل، بادِ صبا موجِ شراب
تشنہ کامانِ خم رنگ طرازی ہشیار ۔۔۔ بہر عیسیٰ ہے خم آب بقا موجِ شراب
کیوں نہ صد رنگ طرازِ دلِ پُرزخم بنے ۔۔۔ ناخنِ موج سے ہے عقدہ کشا موجِ شراب

تصدق میں اس کے نہ دیکھیں گے کیا کیا۔؟   اگر دل ہے حضرت سلامت ــــ سلامت

قدم نہ جادۂ بزم طرب سے باہر کھینچ   بڑھا کے ہاتھ ذرا تو بھی ایک ساغر کھینچ
خمارِ تشنۂ شوقِ نگاہ باقی ہے   بہ چشم ناز دل خوں شدہ کا ساغر کھینچ

چاک نے رشتۂ الفت سے گریباں پکڑا   دست وحشت ہوا داماں سے جُدا میرے بعد
فرصت نیم نگہ ۔ عذر تماشا کر کے   جانثاری کا دیا خوب صلہ میرے بعد

شکست رنگ عاشق غازۂ معشوق کی تزئیں   نسیم آہ بلبل خندہ گلہائے گلستاں پر

نگاہ چشم قاتل صرف نظارہ غنیمت ہے   بخوں غلطیدنِ لبسمل تماشائے تپیدن پر

تکلیف ناخنِ نگہِ ناز کیا ضرور   تازہ ہے چھیڑ چھاڑ سے زخم کہن ہنوز

کنج قفس میں موج صبا سے فزوں نہ ہو   سودائے عندلیب بہ وہم سوائے گل
اے عندلیب محو سپاس نیاز ہو   ہوتا ہے تیرے حال پہ چاک قبائے گل

کس قدر یارب ہوئے صرف غمِ پروانہ ہم   سوزِ دل سے بن گئے خود شمعِ ماتم خانہ ہم
کیا ہوا اظہارِ نشاں اور کیوں نہ ہو رنگِ ثبات   شمع ہم، کاشانہ ہم، داغ دلِ پروانہ ہم
دم زدن میں جلوۂ گل ایک عالم کو کریں   باندھ لیں گر سنگِ رہ بر ہمتِ مردانہ ہم

سپاس سنگ کہاں تک کہ بعد مردن بھی   شکستِ شیشۂ دل کی صدا نہیں معلوم

کون سودائے نکونامی کی منت کھینچے — خوب کرتے ہیں جو سب ہم کو بُرا کہتے ہیں
عرف عشاق ہیں زحمت کش دردِ ہجراں — مُژدۂ وصل کو اندوہ رُبا کہتے ہیں
وہ جو وحشی پسِ دیوار پڑا رہتا تھا — آج مر کر ترے کوچے سے گیا کہتے ہیں
چاک پیراہنِ گل کا یہ سبب ہے شاید — لوگ بلبل کو جو آشفتہ نوا کہتے ہیں

اے جراحت! ریزۂ الماس اب درکار ہے — زخم سینے کو ہمارے، نوکِ سوزن میں نہیں
صبر و شوق و یاس و حسرت جل گئے سب اے آتش — جز شرارِ آہ کچھ بھی دل کے گلخن میں نہیں

کیوں جل رہا ہے رشکِ سلامت سے غیر کے — اب تک خدا نکردہ کوئی درمیاں نہیں

سب داغ دل کو آتش رخسار دوں قرار — پھر کیوں نہ دودِ آہ کو زلفِ رسا کہوں

چھوڑ کر منبر ذرا حوضِ شرابِ ناب میں — آکے دیکھے واعظا بھی اوج پستی ایک دن

صیقلِ حسنِ خداداد میں تزئین کیسی — آئینہ منفعل طوطیٔ تصویر نہیں
لطف طرزِ ستم ناز بہ اندازِ جفا — شوخیٔ رنگِ حنا کی کوئی تقصیر نہیں

ماہ میں عیب حسد ہے ورنہ — داغ لمعانی خورشید نہیں
سنگِ طفلاں کا ہے سودا سر میں — فکر رسوائی جاوید نہیں

چاروں طرف سے شیشہ و ساغر اچھل پڑے — ساقی کا رنگ جم گیا دورِ شراب میں
سایہ نے مار زلف کے بیتاب کر دیا — سنبل پڑا ہے آج نئے پیچ و تاب میں
چشم و چراغ دیدہ پُر نور دل ہوا — ذرہ نے اب قیام کیا آفتاب میں

بجھا سا ہے شعلہ شرارِ نفس کا — جو تھی تاب و طاقت وہ کم دیکھتے ہیں
ریاضؔ اب نگاہِ تغافل میں اس کی — ستم دیکھتے ہیں کرم دیکھتے ہیں

ایک ہے شاہد و مشہود و شہودِ اشکال — پر مشاہد ہے غلط ہی جو یہ منظور نہیں
نوک کی لی دلِ مضطر نے صفِ مژگاں سے — دار پر لفظ انا الحق تو ہے منصور نہیں

سنگدل رنجش آزار بتان بیباک — وحشتِ قیس نہیں تیشۂ فرہاد نہیں
آہِ دل داغِ جگر کا ہے تماشا یعنی — کون کہتا ہے چراغانِ گذر یاد نہیں

آرائشِ جمال دلِ داغدار ہے — چینِ جبیں کا عکس نہیں ہے نقاب میں
آتش فشاں ہے آہ بہ خاکسترِ وجود — لیکن اثر ہے آب و ہوا کا سراب میں

آہِ بلبل کو صبا باندھتے ہیں — غنچہ و گل بھی ہوا باندھتے ہیں
ہم جو کرتے ہیں خیالِ کاکل — رنگ اے وہم و رسا باندھتے ہیں

سوائے آب کے آتش جگر میں خاک نہیں — کہ جز ہوائے مژہ خونِ جگر میں خاک نہیں
شرارِ دم کے سوا ہم نے بارہا دیکھا — یہ آہ! آگ ہے لیکن اثر میں خاک نہیں
یہ پھوڑ پھوڑ کے سر آج کھل گیا ہم پر ، — کہ دردِ سر کے سوا سنگِ در میں خاک نہیں
ریاضؔ گفتہ غالب سے آج آپ کو بھی — "کھلا کہ فائدہ عرضِ ہنر میں خاک نہیں"

عادت سے انکی جانتا ہوں انکی دشمنی — ہر چند میرے ساتھ محبت ہی کیوں نہو؟
اغیار اگر مکلفِ محفل ہوں اے حضور — پھر بزم کیا ضرور ہے خلوت ہی کیوں نہو؟

تابوت اپنی لاش کا اک آبلہ ہوا ‌ ‌ ‌ خار رہ ہوا سے یہ نکلے کفن کے پاؤں
موجِ نسیم نگہت عالم فریب سے ‌ ‌ ‌ کیسے لئے ہیں زلف نے مرغِ چمن کے پاؤں

تا کجا جور غم ہجر خدارا انصاف ‌ ‌ ‌ جوہر تیغِ ستم راہ عدم ہے ہمکو
انتہا ہو گئی ہر بات کی اللہ اللہ ‌ ‌ ‌ یہ تغافل ترے انداز سے کم ہے ہمکو

کیجیے کیا اس جگہ چل کر جہاں کوئی نہو ‌ ‌ ‌ ہم فغاں کوئی نہو ہم داستاں کوئی نہو

روز فراق تا شب ہجراں کی شکل ہو ‌ ‌ ‌ آہوں سے اپنی دود پریشاں اُٹھائیے
تاچند راز عشق کو رسوا نہ کیجیے ‌ ‌ ‌ تاچند صدمۂ غمِ ہجراں اُٹھائیے
یا اے ریاضؔ انکی تمنا نہ کیجیے ‌ ‌ ‌ یا اپنے دل پہ خود غم پنہاں اُٹھائیے

کہا یہ سحر اس صحرانوردی نے کہ آخر کو ‌ ‌ ‌ پریشاں ہو گئی حالت پہ میری اے جنوں وہ بھی
زبونی ہائے قسمت! کیا کہوں اک وہ جو مونس تھا ‌ ‌ ‌ ہوا دشمن ہماری جان کا بخت واژگوں وہ بھی

مژگاں دراز سینہ پر خون میں جا کریں ‌ ‌ ‌ واللہ ہر مکان یہاں لامکان ہے
وحشت زدہ ہوں حلقۂ کاکل کا اے جنوں ‌ ‌ ‌ گردش فلک کی پاؤں کا اپنے نشان ہے

دیدۂ دل منتظر اور نالۂ آغوش وا ‌ ‌ ‌ تا کجا اے ماہوش اختر شماری ہائے ہائے
تا کجا اے عیسیٰ دوران غم بیمار ہجر ‌ ‌ ‌ قطعِ عمرِ خضر ہے اُمیدواری ہائے ہائے

چھوڑا نہ کچھ بھی ضعف نے جز آرزوئے قتل ‌ ‌ ‌ کیسے کہوں کہ تاب ادائے سپاس ہے
چھایا ہے رنج و غم رخ روشن پہ اے ریاضؔ ‌ ‌ ‌ مرنے سے میرے آج بہت وہ اُداس ہے،

کیوں نہ ہر قطرہ میں ہو لفظ انا الحق کی صدا — دل مرا منصور ہے اور موئے مژگاں دار ہے
مرہم زخم جگر ہم کو ہے ناخن کی خراش — آبلہ پانی سے نور دیدہ و دل خار ہے

خیال حلقۂ کاکل اسیری کی تمنّا ہے — جسے ہم دام سمجھے ہیں وہی پرواز عنقا ہے
تماشائے تظلّم دید برق جور ہے یعنی — نگاہ ناز قاتل حسرت چشم تمنّا ہے

مجھ کو یک گونہ تعلق تو ہے ، — اس کو ہر چند عداوت ہی سہی
ایک سے ایک فزوں ہے ہم کو — چشم پوشی نہیں غفلت ہی سہی
ہم بھی ہو جائیں گے آفت انگیز — ناز و غمزہ تری عادت ہی سہی
نقش تمثال بت کافر ہیں — چشم آئینۂ حیرت ہی سہی

اک عمر ذوق و لذّت زخم جگر رہے — اثبات شوق ہو گیا رنگ فنا مجھے
احساں ہوئے ہیں غیر پہ گردن جھکے مری — بے پردہ تیغ یار ہو آئے حیا مجھے

تیغ نگہ کی آب سی جاری ہے بحر خوں — ہر رنگ رنگ جلوۂ موج شراب ہے
یاں جذب شوق واں نگہِ ناز شرمگیں — کس کش مکش میں آج حجاب نقاب ہے

پوچھیں کیا خاکستر پروانہ دل کا نشاں — شمع بزم حسن کیا جانے کہ کس محفل میں ہے
کیوں نہ گل رویان عالم رنگ بلبل ہوں فدا — لالہ زار داغ کا گل میرے آب و گل میں ہے
موئے مژگاں کشمکش ناخن کی کرتا ہے ریاضؔ — عقدہ وابستۂ دل آج کس مشکل میں ہے

ہر اشک ہو گیا در غلطانِ بے بہا — گوہر کی آب مفت میں اے چشم تر گئی
یاں داغِ آتشیں سے دھوئیں دل کے اڑ گئے — واں شعلہ رو کے رخ پہ جو کاکل بکھر گئی

تیغ انداز نازشِ جوہر — جوہرِ شوقِ جاں سپاری ہے
داغ کے گل کھلے ہیں سینے میں — دردکو شوقِ لالہ کاری ہے
اے مسیحا نفس خبر لے جلد — تیری فرقت میں دم شماری ہے

چمکے نشانِ اخترِ فتح نبردِ عشق — آہِ شرر فشاں کے جو نالے علم ہوئے

پھر سیلِ اشک موجۂ طوفانِ چشم ہے — ہر دل میں آہ و نالہ کا جوش و خروش ہے
بزمِ طرب ہے سازِ نشاط و سرور سے — رنگیں نوائے نغمۂ دل بادہ نوش ہے
تیرے سخن پہ کیوں نہ کہیں لوگ مرحبا — تحسین ریاضؔ تجھ پہ کلامِ سروش ہے

خمارِ نشۂ شوق نگہ اب سر سے اترا ہے — بہ آغوشِ عروسِ گورِ وحشی آج غافل ہے

ہاں وحشتِ دل چھوڑ نہ دیکھو مرا احوال — اندازِ جنوں گر کبھی احوال میں آوے

خون و زخمِ دل و مژگاں سے ہے دورِ ساغر — گر نہیں گلشن و جام و مے و ساقی نہ سہی
ہم کو کیا کم ہے نشاطِ غمِ جورِ خوباں، — انبساط و طرب و عشرت و شادی نہ سہی
اپنا ہر شعر ہے پیراہنِ وحشت سارا — چاکِ مضمون و گریبانِ معانی نہ سہی

زلف کی طرح پریشاں ہوں گے — سن کے ژولیدہ بیانی میری
نفیٔ اثباتِ دہانِ قاتل، — تنگیٔ ہیچ مدانی میری

خرمنِ ہستیٔ دہقاں پہ فنا ہو جاؤں — آتشِ برق اگر شعلہ دوانی مانگے

ہوں سرو چراغاں میں ہیں موج زنِ آتش
منظورِ نظر ان کو گر چشم نمائی ہے

کہتے ہیں کہ تلوار اُگلتی ہے میاں سے
موت آئی ہے کیا آج مرے ہاتھ کسو کی
کرتا ہے بہت برق وشی ہاتھ میں آکر
خنجر میں بھی عادت ہے مرے عربدہ جو کی

آبلہ پائی میں وحشت ہے نمایاں مجھ سے
خار کی طرح کھٹکتا ہے بیاباں مجھ سے
عالمِ داغ جنوں دیکھ کے آتش رخسار
سایۂ مہر سے رہتے ہیں گریزاں مجھ سے
موج زن آہِ شرربار جو داغِ دل ہے
آتشِ رشک سے جلتے ہیں چراغاں مجھ سے

دیکھ لے بسمل تماشائے طپیدن گر کبھی
چشمِ جوہر سے دمِ شمشیر حیرانی کرے
لذتِ خنجر بوقتِ ذبح ہو جائے حصول
یاوری میری اگر کچھ بھی گرانجانی کرے

نہیں ہے منہ سے اگر، خیر تیغ ہی سے سہی
مرے سوال کا قاتل مگر جواب تو دے
یا مس پائی نہ تسکین شعلہ رُخ سے
ذرا تو آتشِ سوزاں میں دلکو آب تو دے

قدم رنجہ کریں شاید کبھی وہ، اس تمنا میں
چراغ صرف بالیں دیدۂ بیدار بستر ہے
عبث فکر اسیری ہے کہ فرطِ ضعف سے کاکل
ترے وحشی کے الجھانے کو کافی تار بستر ہے

لبریز ہے خوں ناب عاشق،
ساقی۔ ساغر میں مے نہیں ہے
اثبات و نفی۔ نفی و اثبات
ان کے تو دہن میں ہے۔ نہیں ہے

رگِ گل کار نشتر کر رہی ہے آج وحشت سے
میری آنکھوں میں گلشن خار پیراہن۔ ہو جائے

مطلب ہے کہ ہو دامنِ عصمت نہ کہیں چاک
مجھ چاک گریباں سے جو پروا نہیں کرتے
قبر پر ٹھوکر لگانے کی صدا ہے یار ریاضؔ
فتنۂ شورِ قیامت ہائے شوق انگیز ہے

ہجر و غم میں اس زلیخا وش کے ابتوائے ریاضؔ
صد غمِ ہجراں ہوا ہر یوسفِ ثانی مجھے

یہ دیکھے جلوۂ آتش رخاں کب تاب ہے مجھکو
شرار یک نفس دل ہو یہ دیکھا جائے ہے مجھسے
ثبات جادۂ عشقِ بتاں بھی سخت مشکل ہے
کہ چھوڑا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھسے

خیالِ زلفِ بتاں ہے بذلت و خواری
تمہارے عشق میں سودائے سر سلامت ہے
وہ کر رہے ہیں بصد عجز منّت و زاری
ریاضؔ ہوش میں آؤ یہ کیا قیامت ہے

مُردمک میں دیدہ روشن کی وہ جاوے مجھے
راہ صحرائے جنوں کوئی جو بتلادے مجھے
طوطیٔ تصویر حیرت سے اگر ہوں میں اسیر
عکسِ زنداں خانہ آئینہ دکھلاوے مجھے

دامن بہ جرمِ شوق تھا آلودہ دُھل گیا
تیغ نگہ کی آب سے ہم پاک ہو گئے
جلتا ہے دل کے کیوں نہ جلا یار قیب کو
کیوں پہلے سوزِ رشک سے ہم خاک ہو گئے

غنچہ گستن، خامشی بیجا۔ تبسم رنگ آہ
نالۂ بلبل لب گل در فضائے خندہ ہے
آہ پُر تاثیر ہجراں مژدۂ شوقِ وصال
گریہ ہے برق افشانی صبر[لہ] بنائے خندہ ہے

ہو جائے چارۂ دل پر زخم خوں فشاں،
مژگاں کی طرح اس میں اگر جا کرے کوئی
کیا فائدہ کہ منّت طفلاں کوئی اُٹھائے
کیا فائدہ کہ زُلف کا سودا کرے کوئی

لہ صاف پڑھا نہیں گیا۔

پیش از مرگ بھی پامال خرام جاں ہوں
سبزہ ساں شوق جو تربت پہ اُگاتا ہے مجھے
سر بکف آپ سے جاتا نہیں لے جذبۂ شوق
سوئے صحرا کوئی کھینچے لئے جاتا ہے مجھے

یہ کشت زار ہستی کاہش صد خون دہقاں ہے
شرار برق خرمن جوہر شمشیر عریاں ہے
نوائے صور اسرافیل شورش ہائے افغاں ہے
فروغ مہر محشر خندۂ چاک گریباں ہے
تمنائے شہادت میں یہاں تک خون رویا ہے
کہ ہر موئے مژہ آتش زن صد شاخ مرجاں ہے

موئے مژہ ہیں موجزن دل کہ رنگ خون
کسب فروغ بادہ سے مینا کہیں جسے
رسوائے دہر ہونے سے کیا فائدہ ریاضؔ
وہ کام کیوں نہ کر۔ کہ سب اچھا کہیں جسے

سنگِ سخن سخت شکستِ دلِ حیراں
ہر شیشہ پری دش دلِ پیمانِ وفا ہے
کیوں بل پڑا ڈس پہ افعی کو نہوئے
داغِ دل و گیسو میں عجب پیچ پڑا ہے

پھر طالب رفو جگر چاک چاک ہے
ہر لخت شوق بخیۂ مژگاں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں جلوۂ صد ناز گلرخاں
مدت ہوئی ہے ترک گلستاں کئے ہوئے
پھر چاہتے ہیں ذلت و رسوائیاں مری
بیٹھے ہیں پھر رقیب کو درباں کئے ہوئے
پھر گرم نالہائے شرر بار ہے ریاضؔ،
ہر چشم تر سے جوشش طوفاں کئے ہوئے

قدم جو سر پہ بصد شوق جانِ جاں کے لئے
ضیائے مہر ہے ہر ذرہ آسماں کے لئے
یہ کس کے جلوۂ پُر نور شعلۂ رخ سے
فروغ دام ہے آہ شرر فشاں کے لئے

غالبؔ ذوقؔ کے ایک سیرت نگار کی نظر میں

غالب۔ ذوق کے ایک سیرت نگار کی نظر میں

صاحبِ "آبِ حیات" آزاد کے خلاف جو ادبی فردِ جرم پچھتّر سال ادھر مرتب کی گئی تھی۔ اس میں ایک الزام یہ بھی تھا کہ آزاد نے اپنے اُستاد محمد ابراہیم ذوق کو غیر معمولی اہمیت دے کر اُن کے دوسرے معاصرین کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ خصوصاً غالب اور مومن کے شعری کردار کو "آبِ حیات" میں اس طرح دبا کر پیش کیا گیا ہے کہ ذوق کے مقابلے میں نہ غالب کے جسدِ شعری میں غالب کی روح باقی رہی نہ مومن میں مومن کا فکر و فن۔ اور بہت حد تک یہ بات صحیح بھی ہے کہ آزاد نے اب سے ڈیڑھ سو سال پرانی قدروں کے احترام میں اُستاد اور شاگرد کے اس متبرک رشتہ کو "روائتی آن بان" کیساتھ قائم و برقرار رکھنے میں کوئی کمی نہیں کی جو اس دور کا علمی اور مجلسی خاصۂ مزاج تھا۔ جس زمانے میں "آبِ حیات" کی ترتیب و تالیف کی گئی، دلّی پر کیا منحصر۔ ہندوستان کا ہر چھوٹا بڑا شہر مختلف "شعری سجّادوں" میں بکھرا ہوا تھا۔ ہر استاد کی "مسندِ شعر و ادب" کا ایک خاص رنگ تھا اور ہر خانوادۂ فکر کے پرستاروں کا ایک خاص نعرہ؟ کوئی سعادت مند شاگرد اپنے استاد کے مرتبہ کو "سبک" کرنے کا الزام اپنے سر نہیں لے سکتا تھا پھر اگر آزاد نے "آبِ حیات" کے قیمتی صفحات کا دروازہ اپنے استاد (ذوق) پر کھول دیا تو کیا قصور کیا؟

جہاں تک "آبِ حیات" کی ادبی افادیت کا تعلق ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اُردو ادب میں تذکرہ نگاری کی جو نئی راہیں آزاد نے دکھائیں ان کے پیش رو اس سے بہت دور تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کر لینا چاہئے کہ "آبِ حیات" ایک تذکرہ ہے تنقیدی جائزہ نہیں۔ اور آزاد کے پیشِ نظر کوئی ایسا "علمی مشن" نہیں تھا جس کی

روشنی میں یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ انھوں نے اپنے استاد کے معاصرین غالب اور مومن کے خلاف کسی ایسی مہم چلانے کا منصوبہ بنایا تھا جس سے ان کے فکر و فن کی بلندیوں کو نامنصفانہ طریقے پر پست کرنا مقصود تھا۔ اور اس کا سب سے بڑا ثبوت آزاد کے شاگرد رشید خان احمد حسین خاں کی "حیاتِ ذوق" ہے جو آب حیات کی اشاعت کے سات آٹھ سال کے اندر ہی ۱۸۹۵ء میں "مطبع خادم التعلیم لاہور" نے شائع کی تھی۔

"آبِ حیات" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۷ء میں منشی گلاب سنگھ ناشر کتب لاہور نے "مطبع مفیدِ عام لاہور" میں چھپوا کر شائع کیا تھا اور اس کے شائع ہوتے ہی شعرائے اردو کی سوانح عمریوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ پچیس سال کے اندر غالب، ذوق، انشار وغیرہ کے متعدد سوانح حیات لکھ ڈالے گئے جن میں سے چند درج ذیل ہیں۔

(۱) حیاتِ ذوق۔ خان احمد حسین خاں۔ مطبوعہ مطبع خادم التعلیم لاہور ۱۸۹۵ء۔

(۲)[۱] حیاتِ غالب۔ سید محمد مرزا اوج لکھنوی۔ مطبوعہ نگارستان پریس لکھنؤ اکتوبر ۱۸۹۹ء۔

(۳) حیاتِ انشار۔ ایم عبد العلی برلاس۔ مطبوعہ مطبع خادم التعلیم لاہور ۱۹۰۲ء۔

(۴)[۲] حیاتِ غالب۔ مرتبہ کارپردازان "اردو اخبار" لاہور مطبوعہ مطبع منشی رام اگروال لاہور اپریل ۱۹۰۵ء۔

(۵) حیاتِ مرزا غالب۔ ایم عبد العلی برلاس (تفصیلات معلوم نہ ہو سکیں غالباً "پیسہ اخبار" لاہور نے لکھوائی تھی اور انھیں کے مطبع خادم التعلیم لاہور سے شائع ہوئی تھی۔)

لیکن یہ جتنی سوانح عمریاں لکھی گئی ہیں ان کا اصل ماخذ "آبِ حیات" ہی کہی جا سکتی ہے کہیں

---

[۱] ملاحظہ ہو میرا مضمون "حیات غالب" مطبوعہ "ماہِ نو" کراچی (پاکستان) شمارہ خصوصی مارچ ۱۹۶۴ء۔

[۲] ملاحظہ ہو میرا مضمون "غالب کی ایک قدیم سوانح عمری" مطبوعہ ادبی دنیا لاہور، مارچ ۱۹۶۷ء۔

نادم سیتاپوری

کہیں چند پرانے تذکروں کا بھی ذکر ملتا ہے مگر وہ بھی کچھ اس انداز میں جیسے یہ بھی آزاد کے منھ کی بات ہو بیشتر حالات اور لطائف "آبِ حیات" ہی سے لئے گئے ہیں۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کاروباری اہمیت زیادہ تھی ادبی افادیت کم۔

"حیاتِ ذوق" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جسے "پیسہ اخبار" (لاہور) والے منشی محبوب عالم مرحوم نے احمد حسین خاں سے لکھوایا تھا۔ اس سے قبل ایم عبدالعلی برلاس سے "حیاتِ انشار" بھی لکھوا کر ۱۹۰۲ء میں شائع کی جا چکی تھی اور برلاس کی "حیاتِ مرزا غالب مرحوم" بھی اسی اشاعتی پروگرام سے تعلق رکھتی ہے۔ منشی محبوب عالم پنجاب کے منشی نولکشور تھے یوپی۔ میں جس وسیع پیمانے پر اردو فارسی اور دوسری زبانوں کی کتابوں کا اشاعتی کام منشی نولکشور کے ہاتھوں انجام پایا اس کی دوسری مثال نہیں ملتی البتہ پنجاب میں منشی محبوب عالم دوسرے شخص تھے جنھوں نے اس اہم کام میں اپنے دیرینہ رفیق منشی نولکشور کا ہاتھ ضرور بٹایا تھا۔

"حیاتِ ذوق" کے مؤلف احمد حسین خان اس عہد کی اُردو دنیا میں، ایک باعزم و باعمل مصنف، مؤلف مترجم اور صحافی کی حیثیت سے خاصی شہرت رکھتے تھے۔ صاحبِ "آبِ حیات" محمد حسین آزاد کے شاگردوں میں مولوی ممتاز علی مرحوم (امتیاز علی تاج کے والد) کے بعد انھیں خصوصی درجہ حاصل تھا۔ ذوق کے شاگردوں کا ذکر کرتے ہوئے احمد حسین خاں نے لکھا ہے:-

> شمس العلمار مولوی محمد حسین آزاد — یہ صاحبِ کمال وہ شخص ہے کہ اگر شیخ مرحوم (ذوق) زندہ ہوتے تو واقعی فخر کرتے اور نازاں ہوتے کہ ان کے شاگردوں کی فہرست میں ایسے لائق اور فاضل شخص کا نام موجود ہے ان کی تصنیفات سے پنجاب اور ہندوستان میں بچہ بچہ واقف ہے۔ آپ ابتدا میں پروفیسر عربی و فارسی گورنمنٹ کالج (لاہور) میں تھے۔ اب پنشنی ہیں۔ انھوں نے سرکار دولت مدار کی بہت سی عمدہ عمدہ

خلوت کی ہیں چنانچہ پنڈت من پھول[۱] سی۔ ایس۔ آئی کے ہمراہ ایران کی سفارت کے لئے گئے تھے۔ ان کے مخالف اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی صاحب کو عربی کی استعداد اچھی نہیں۔ مگر راقم نے گورنمنٹ کالج لاہور میں ان سے پڑھا ہے اور کبھی کسی قسم کی رکاوٹ یا دقت پیش نہیں آئی۔ میری رائے میں نثر اُردو جیسے وہ لکھتے ہیں ہندوستان بھر میں کوئی نہیں لکھتا۔ ان کے لئے "ظہوری ہند" کا خطاب بجائے شمس العلمار کے بہت موزوں تھا"

(صفحہ ۴۰ حیاتِ ذوق)

منشی احمد حسین خاں لاہور کے ادبی حلقوں میں ایک ممتاز حیثیت رکھتے تھے اور اس کی سب سے بڑی وجہ ان کی "ترجمہ کاری" کی خداداد صلاحیت تھی۔ انگریزی داں ہونے کی وجہ سے ان کی مقبولیت اپنے عہد میں اچھی خاصی تھی۔ بحیثیت مترجم لاہور کی "ڈویژنل کورٹ" میں ملازم بھی تھے اور اپنے طور پر ادبی مشاغل میں بھی منہمک رہتے تھے۔ "حیات سعدی" اور "آئینۂ روزگار" کے علاوہ ان کی تصانیف میں کئی ناول شمعِ شبستاں۔ درد۔ سُرخ حرف اور "واہ" ایک زمانے میں دلچسپی کے ساتھ پڑھے جاتے تھے۔

اس صدی کی دوسری دہائی میں انھوں نے لاہور سے "شباب اُردو" نام کا ایک ادبی ماہنامہ بھی نکالا تھا جس کا پہلا شمارہ ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ "شبابِ اُردو" کے ادارتی فرائض خود منشی احمد حسین خاں انجام دیتے تھے لیکن انھیں شیخ عبدالقادر (ایڈیٹر مخزن لاہور) خواجہ دل محمد اور شیخ عبداللطیف تپش جیسی بلند پایہ شخصیتوں کا تعاون خاص طور پر حاصل تھا۔ "شبابِ اُردو" کے چند شمارے جو میری نظر سے گزرے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس

---

[۱] من پھول اور آزاد کے سفر ایران کی سیاسی اہمیت کے متعلق حال میں جو انکشافات ہوئے ہیں اس سلسلے کی یہ ابتدائی اطلاع ہے جو ۱۸۹۵ء میں (غالباً) سب سے پہلے احمد حسین خاں نے دی ہے۔ آزاد مدت العمر اس سیاسی سفر کو چھپانے کی کوشش کرتے رہے۔ نادم سیتاپوری

ماہنامہ کو اس دور کے بیشتر علمی و ادبی افراد کا اشتراک و تعاون حاصل تھا۔ خواجہ حسن نظامی علامہ رنجور عظیم آبادی۔ اظہر علی آزاد۔ نیاز فتحپوری۔ عشرت لکھنوی۔ شاہ دلگیر اکبر آبادی مولانا ظفر مہدی گہر جائسی۔ اکبر الہ آبادی۔ عزیز لکھنوی۔ حفیظ جالندھری۔ مانی جائسی تلوک چند محروم۔ یاس عظیم آبادی۔ محشر لکھنوی۔ ثاقب لکھنوی۔ باسط بسوانی غرضیکہ اس عہد کے مشاہیر میں شاید ہی کوئی بچا ہو جس کا قلمی تعاون "شباب اُردو" کو نہ حاصل ہو۔

میرا خیال ہے کہ اس وقت پنجاب سے جو معیاری ادبی رسائل نکلتے تھے، "شبابِ اُردو" اُن میں "مخزن" کے بعد ایک خاص اہمیت کا حامل تھا۔

احمد حسین خاں کی تصانیف اور مضامین دیکھنے کے بعد اس کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے کہ وہ بہت ہی متوازن ذہن رکھنے والے انسان تھے اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ذوق کے شاگردِ رشید محمد حسین آزاد نے جس طرح اس ادبی نسل کی تربیت کی اس سے ایک متوازن اور منصفانہ تنقیدی شعور کے ابھرنے میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں پڑی اور خود آزاد کا ذہن فطری طور پر اس تعصب اور گندگی سے پاک تھا جس کا الزام آج ان پر لگایا جاتا ہے۔

آبِ حیات میں اپنے چہیتے اُستاد (ذوق) کی شخصیت اور فن کے بارے میں کافی تفصیلات پیش کرنے کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں تھا کہ آزاد اپنے قابل صد احترام اُستاد کے اس "روائتی احسان" سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے جس کی ذمہ داری اس عہد کی "علمی اقدار" نے ان پر عائد کی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو آزاد کے شاگرد رشید احمد حسین خاں کا شمار اس عہد کے غالب پسندوں میں نہ کیا جاتا۔ بلکہ غالبؔ کے مقابلے پر ان کا جھکاؤ ذوقؔ کی طرف زیادہ ہوتا۔

احمد حسین خاں کو غالبؔ کی شخصیت اور فن سے کتنا فطری لگاؤ تھا اس کا جواب آج بھی "شبابِ اُردو" کی فائلوں میں ملتا ہے۔ غالبؔ کی آخری تصویر کا تعارف کراتے ہوئے لکھا گیا ہے:۔

"ابھی کچھ لوگ دہلی میں ایسے موجود ہیں جنھوں نے

غالبؔ مرحوم کو دیکھا ہے لیکن بے شمار مداحان غالبؔ کے لئے جو ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں ملک کے ہر حصّہ میں موجود ہیں غالبؔ کی صحیح تصویر ایک غیر معمولی لطف اور وقعت رکھتی ہے اس لئے "شباب" کا یہ پرچہ اس تصویر پر شیب سے مزین ہو کر پیش ہوتا ہے۔

غالبؔ مغفور کی کئی تصویر شائع ہو چکی ہیں۔ سب سے پہلے مولٰنا حالؔی مرحوم نے اپنی کتاب "یادگارِ غالبؔ" کے ورق اول پر ایک تصویر شائع کی تھی جس پر یہ شعر تھا ؎

بیاورید گر ایں جا بود زباں دانے
غریبِ شہر سخنہائے گفتنی دارد

اس کے بعد بعض اور مطبوعات کے ساتھ غالبؔ کی تصویر چھپی ہے۔ چنانچہ ایک تصویر "دیوانِ غالبؔ" کے اس خوبصورت ایڈیشن کی زینت ہے جو مطبع نظامی بدایوں نے شائع کیا۔ مگر ہمیں وہ تصویر زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے جو حال میں "دیوان غالبؔ" مرتبہ خان بہادر شیخ عبدالقادر صاحب بیرسٹر لا آنریری ایڈیٹر "شباب اُردو" کے ہمراہ شائع ہوئی ہے۔ یہ تصویر مرزا غالبؔ مرحوم کی آخری عمر کی یادگار ہے۔ احباب کے بے حد اصرار پر مرزا غالبؔ نے باوجود ضعفِ پیری کے یہ فوٹو اتروانے کی تکلیف فرمائی۔ یہ تصویر انھوں نے اپنے عزیز دوست پیارے لال صاحب

(آشوبؔ) کو جو بعد ازاں بہ خطاب "رائے بہادر پیارے لعل" علمی دنیا میں معروف ہوئے "تحفۃً" دی تھی۔ اُن سے آپ کے قابل برادر زادہ سری رام ایم۔اے مؤلف "خمخانہ جاوید" کے ہاتھ آئی اور ان سے مستعار لے کر شیخ صاحب نے ہاف ٹون تیار کرایا۔"

ایڈیٹر

(ماہنامہ شباب اُردو) شذرات صفحہ ۲، بابتہ ماہ جون ۱۹۲۰ء جلد ۱ شمارہ ۳)

"حیاتِ ذوق" کا زمانہ تالیف (۱۸۹۴ء) کم و بیش وہی ہے جب حالؔی کے تنقیدی زاویوں نے اُردو ادب و زبان کو ایک انقلاب کا پیغام دیا تھا اور قدیم طرزِ سخن شناسی کے سامنے لمحاتِ فکر کے ایسے پہاڑ کھڑے کر دئے تھے جنھیں عام ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اس وقت تک "تنقید" تنقیص و تعریض سے کچھ زیادہ آگے نہ بڑھ سکی تھی تبصرے اور موازنے کے نام سے جو تنقیدی جائزے لئے جاتے تھے اُن میں توازن اور اعتدال کا عنصر بہت ہی کم ہوتا۔ تعریف کرنے پر آئے تو زمین و آسمان کے قلابے ملا دئے۔ غلطیاں نکالنے بیٹھے تو آنکھیں بند کر کے ایک ایک مصرع کی مٹّی پلید کر دی۔ اگر فنی خامیاں نہ مل سکیں تو طنز و مزاح کے ترکش خالی کر دئے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہوا تو خود "فنکارانہ" اصلاح دیکر یا اسکے استاد کے دوسرے اشعار کو "پنجۂ عتاب" میں لے کر موضوع کا رنگ بدل دیا۔

احمد حسین خاں نے "حیاتِ ذوقؔ" میں ذوقؔ و غالبؔ کا جو موازنہ کیا ہے "جدید تنقید" کے تقاضوں سے اسے کتنا ہی دور کیوں نہ کہا جائے؟ پھر بھی اس میں ایک توازن اور انصاف ضرور ہے اور یقین کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر صاحبِ "آب حیات" کی آغوش تربیت نے اپنے اس ہونہار شاگرد کو ایک صحیح اور منصفانہ تنقیدی شعور نہ دیا ہوتا تو اس کا ذہن غالبؔ کے کمالِ فن کی رعنائیوں سے شاید کبھی ہم آہنگ

نہ ہو سکتا ——— اور یہ کھلا ہوا ثبوت ہے اس بات کا کہ آزاد نے "آبِ حیات" میں اپنے استاد ذوق کا جو روایتی احترام کیا ہے اس کا مقصد دوسروں کے فکر و فن کو پست و سبک کرنا نہیں تھا۔

جہاں تک میری رسائی ہو سکی ہے "حیاتِ ذوق" (مؤلفہ احمد حسین خاں) کا صرف ایک ہی ایڈیشن مطبع خادم التعلیم پنجاب (لاہور) نے ۱۸۹۵ء میں شائع کیا تھا۔ "انٹروڈکشن" کے علاوہ اس کتاب کو حسبِ ذیل پانچ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔

"انٹروڈکشن" کے عنوان سے احمد حسین خاں نے جو "آغازیہ" تحریر کیا ہے اس پر ۱۲؍ اگست ۱۸۹۴ء درج ہے۔

فصل پہلی ——— پیدائش اور بچپن

فصل دوسری ——— طبعی عادات اور حالات

فصل تیسری ——— نشو نمائے شاعری

فصل چوتھی ——— تصنیف پر رائے

فصل پانچویں ——— ذوق غالب اور انشا کا مقابلہ

آخری باب میں ذوق سے غالب اور انشاء اللہ خاں انشاؔ کا موازنہ کیا گیا ہے۔ اس موازنے یا مقابلے کے لئے ذوق کے معاصرین میں صرف غالب ہی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ اور متقدمین میں انشاؔ کا۔ غالب کی شخصیت اور فن پر کسی حد تک تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور آخری حصّہ میں موازنہ یا مقابلہ بھی کیا گیا ہے جو من و عن نقل کیا جا رہا ہے۔

"نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں غالب کے خاندان کا سلسلہ افراسیاب بادشاہ توران سے ملتا ہے۔ ان کے دادا گردشِ زمانہ سے شاہ عالم کے زمانے میں دہلی آئے تھے۔ ان کے والد عبداللہ بیگ

ابتدا میں حیدر آباد (دکن) میں تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہے۔ کئی برس کے بعد ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں یہ صورت بگڑ گئی۔ اس پر انھوں نے راجہ بختاور سنگھ کی ملازمت اختیار کی اور ایک لڑائی میں کام آئے۔

اس وقت مرزا پانچ برس کے تھے جب سر سے والد کا سایہ اُٹھ گیا۔ مرزا عبداللہ بیگ کی وفات پر اُن کے بھائی نے جو اکبر آباد (آگرہ) کے صوبیدار تھے اس "درِّ یتیم" کو دامن میں لے لیا۔ اتفاقاً یہ بھی مرگِ ناگہانی کے پنجے میں گرفتار ہو گئے۔ رسالہ برطرف ہو گیا اور جاگیر ضبط ہو گئی۔ بزرگوں نے لاکھوں روپیہ کی جائیداد چھوڑی تھی مگر انقلابِ زمانہ پر کس کا زور چل سکتا ہے مرزا غالبؔ کے حصّہ میں صرف ملکِ سخن کی حکومت ہی آئی اور دولتِ مضامین پر قناعت کر کے غریبانہ حالی سے زندگی بسر کرنی پڑی۔ آخر رامپور کے نواب نے بلوا بھیجا اور تعظیم خاندانی کے ساتھ ٹھہرا دیا کہ اگر مرزا دلّی میں رہیں تو سو روپیہ ماہوار اور اگر رام پور میں رہیں تو دو سو روپیہ ماہوار ملا کرے۔

مرزا بیچارے اکثر قرض دار رہا کرتے تھے آخر قرض داروں نے نالش داغ دی۔ جواب دہی میں طلب ہوئے تو یہ شعر "جوابِ دعویٰ" کی جگہ پڑھ دیا ؎

مفت کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہاں
رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن،

مرزا نے ۷۲ سال کی عمر پائی۔ مرنے سے چند سال پہلے کانوں سے اونچا سنائی دینے لگا۔ خوراک یہ رہ گئی تھی کہ صبح کو پانچ سات بادام کا شیرہ، بارہ بجے یخنی کا ایک کٹورا۔ شام کو چار کباب تلے ہوئے۔ آخر ۱۸۶۹ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں ان کا مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ مرنے سے چند روز پہلے یہ شعر کہا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

اگر نظرِ انصاف سے تعصبِ مذہبی۔ اور رعایتِ تعلقداری اور قرابت کو بالائے طاق رکھ کر دیکھا جائے تو بادی النظر میں معلوم ہو جاتا ہے کہ غالبؔ کا کلام جملہ شعرائے اردو کے کلام سے بہتر اور برتر ہے۔ ذوقؔ مرحوم کو اُن کی معنیٰ آفرینی اور نازک خیالی سے کچھ نسبت نہیں۔ اُن کی صاف اور عام فہم غزلیں میرؔ اور جرأت کے کلام کو شرماتی ہیں اور اُن کی ادق اور مشکل غزلیں انشاؔ، سوداؔ اور ذوقؔ کے کلام پر اُوس برساتی ہیں۔ اگر ذوقؔ نازک خیالی کے آسمان کے باز تھے تو مرزا غالبؔ عقابِ بلند پرواز تھے۔ اگر ذوقؔ اقلیم سخن کے بادشاہ تھے تو غالبؔ کشورِ سخن کے شہنشاہ تھے۔ ذوقؔ مرحوم نے بہادر شاہ ظفر کی حمایت

اور پشت پناہی سے "ملک الشعراء" کا خطاب پایا
اور مرزا غالب نے گوشہ نشینی میں ہی وہ کچھ کر دکھایا
کہ چار دانگ عالم میں کوسِ شہرت بجایا۔ ذوق مرحوم
کا نام تو ہندوستان کی چار دیواری تک محدود ہے،
مگر غالب کا کلام ایران تک پہنچا اور علم و زبان فارسی
میں سند سمجھا گیا۔ غالب اُردو لٹریچر کے "ڈاکٹر جانسن"
کی طرح "ڈکٹیٹر" یعنی زبانِ اُردو کے ادیب تھے۔
جب کسی مشکل شعر کے معنی حل طلب ہوتے تھے یا کوئی
امر فارسی یا اُردو کا تحقیق طلب ہوتا تھا تو لوگ غالب
مرحوم ہی کی خدمت میں رجوع لاتے تھے۔ غالب کا کلام اُردو
زبان کی ٹکسال ہے۔ غالب مرحوم مضامین و معانی کے بیشہ
کے شیر تھے۔ اُن کے اکثر شعر ایسے اعلیٰ درجۂ رفعت پر
واقع ہوئے ہیں کہ ہر ایک کا ذہن وہاں تک نہیں پہنچ
سکتا۔ ذوق نے صرف نظم پر قلم اُٹھایا اور مرزا غالب نے کشورِ
نثر میں بھی سکہ چلایا۔ سکہ بھی وہ سکہ کہ جس کے طغرائے
شاہی میں یہ نقش ہوا کہ جب تک اُردو فارسی کی نظم و نثر
کی جان میں جان ہے مرزا غالب کا نام بھی زندہ رہے گا۔
ذوق مرحوم صرف شاعر ہی تھے اور غالب علاوہ شاعر وغیرہ
کے ایک صاحبِ نظر مؤرخ بھی تھے۔ حضور سے خدمتِ
تاریخ نویسی ان کے سپرد ہوئی تھی "مہرِ نیمروز" اسی زمانے
کی تصنیف ہے اور اسی زمانے میں یہ خطاب عطا ہوا تھا۔
یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب بہادر نظامِ جنگ۔"

(صفحات ۶۰ لغایت ۶۲ حیاتِ ذوق)

غالب اور ذوقؔ کے مشہور سہروں کا ذکر کرتے ہوئے مؤلف "حیاتِ ذوقؔ" نے لکھا ہے:-

"دونوں سہرے اپنی اپنی جگہ بے نظیر ہیں مگر پہلے مرزا نے
اپنی طبیعت پر زور ڈال کر سہرا کہا۔ اور ذوقؔ نے اس سہرے
کو روبرو رکھ کر سہرے پر سہرا کہا۔ باوجود اس امر کے سخن
کے پرکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ کس سہرے کو ترجیح دینی
چاہیے؟ میری رائے ناقص میں کہی ہوئی غزل پر غزل کہنی
نہایت آسان بات ہے۔"

(صفحات ۶۵ - ۶۶ حیاتِ ذوق)

غالب کے فن پر مؤلف "حیات ذوقؔ" کا یہ تبصرہ - اگرچہ جدید تنقید کے اصولوں پر پورا نہیں اترتا پھر بھی ایک ایسے تاثر کا آئینہ دار ہے جو اس زمانے کے اسلوبِ سیرت نگاری سے مطابقت نہیں کرتا اب سے چالیس پچاس سال ادھر ہر سیرت نگار عام طور پر اپنے "ہیرو" کو اس کے متقدین اور معاصرین کے مقابلہ پر زیادہ نمایاں و برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اور جب کسی "معاصرانہ چشمک" کا سوال سامنے آجاتا تھا تو پھر نہ پوچھیے۔ "صاحب تذکرہ" کو اتنی مافوق الکردار اہمیت دی جاتی تھی کہ اس کا صحیح کردار مضحکہ خیز بن جاتا تھا۔

احمد حسین خاں (مؤلف حیاتِ ذوقؔ) کا یہ مبہم تبصرہ! جسے ذوقؔ کی سوانح حیات میں ایک خاص اہمیت دی گئی ہے۔ اب سے ستّر بہتّر سال قبل کا ایک فنی مطالعہ ضرور کہا جاسکتا ہے اور اس بات کا مظہر ہے کہ غالب اپنی وفات کے بعد پچیس ہی سال کے اندر اپنے صحیح خدوخال میں سامنے آچکا تھا۔ جب "آبِ حیات" کے خالق آزاد بھی زندہ تھے اور دلّی کے وہ اربابِ فکر و نظر بھی جو ہمیشہ یہی کہا کیے کہ۔

مگر اپنا کہا یہ آپ سمجھیں! یا خدا سمجھے!

غالب ـ تحقیق ـ اپریل فول

ذوالفقار

غالب تحقیق ـــــ اپریل فول

۸ جنوری ۱۹۶۹ء کے " ہماری زبان" (علی گڑھ) میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے " دیوانِ غالب - اپریل فول اور اہلِ تحقیق" کے زیرِ عنوان "بھوپال والی" اس غزل پر چند تحقیقی زاویوں سے روشنی ڈالی ہے جس کا تفصیلی تذکرہ میں اپنی کتاب" غالب کے کلام میں الحاقی عناصر"[1] (شائع کردہ ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ ۱۹۶۵ء) میں بالتفصیل کرچکا ہوں -

بقول ڈاکٹر ابو محمد سحر :-

" جہاں تک اس کے کلام غالب نہ ہونے کا تعلق ہے
مالک رام صاحب اپنی " غلطی " کا اعتراف بھی کرچکے
ہیں اس لئے فی نفسہٖ یہ معاملہ خارج از بحث ہے "

پھر بھی ڈاکٹر ابو محمد سحر نے ضروری سمجھا کہ " اُردو تحقیق کے معیار اور طریقۂ کار کی کوتاہیوں کا جائزہ " لینے کے لئے اسی خارج از بحث موضوع کو "نشانِ راہ" قرار دیں اور یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کریں -

" چونکہ غالب صدی کے سلسلے میں اس وقت غالب
کی زندگی اور کلام پر "نئے مواد کی تلاش و جستجو" کا بازار
گرم ہے اس لئے ان امور پر جتنا زور دیا جائے کم ہے
ورنہ وہی حال ہوگا کہ

---

[1] اس کتاب کا نیا ایڈیشن داضافے کے ساتھ مدینہ پبلشنگ کمپنی بندر روڈ کراچی نے شائع کردیا ہے -

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

کاش غالبؔ کا ہر محقق "فرشتہ" نہیں۔ غالبؔ کا آدمی
بننے کی کوشش کر سکے"۔

بظاہر جناب مالک رام کے "اعترافِ شکست" کے بعد اس مسئلہ کو ختم ہی ہو جانا چاہیئے تھا لیکن ڈاکٹر ابو محمد سحر کے نزدیک اِس اعتراف کے بعد بھی جناب مالک رام کی یہ غلطی اتنا بڑا ادبی و تحقیقی "سانحہ" ہے جسے شاید کبھی بھی معاف نہیں کیا جا سکے گا۔ ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں :۔

"اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ اُردو تحقیق کا سب سے "عبرت انگیز" واقعہ کیا ہے؟ تو میں کہوں گا کہ "دیوانِ غالبؔ" مرتبہ مالک رام میں اس غزل کی شمولیت جس کا مقطع ہے ؎

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو"

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے اس گرانقدر تحقیقی مقالے میں اُردو تحقیق و ریسرچ کے جن "مبہم نقوش" کو ابھارنے کی کوشش فرمائی ہے وہ تمثیلات و واقعات کی جھنکار میں اپنے بنیادی مقاصد سے محروم ہو گئے ہیں اور جو "غیر واضح نقوش" سامنے آسکے ہیں ان سے یہی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تحقیق میں "محتاط نگاری" سے کام لے کر "تیز روی" سے دور رہنا چاہیئے اور صرف موضوع کی طرف دوڑنے کی کوشش نہ کرنی چاہیئے بلکہ اس کی "پنہائیوں" پر بھی گہری نظر رکھنی چاہیئے۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں "ریسرچ اور تحقیق کے یہ بنیادی اصول ہیں ان سے ہٹ کر کوئی بھی تحقیق کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ اب رہا یہ سوال کہ جناب مالک رام اور مولانا عرشی ان ذمہ داریوں کو کما حقہٗ پورا کر سکے یا نہیں؟ میرے

نزدیک ڈاکٹر ابو محمد سحر اسے ثابت نہیں کر سکے کہ ان حضرات نے غیر ذمہ دارانہ غفلت کو دخل دے کر کسی ایسے تحقیقی جرم کا ارتکاب کیا ہے جس کی کسک جناب مالک رام کے "اعتراف" کے بعد بھی دُور نہیں ہوتی۔

اگر جناب مالک رام کی یہ "تیز روی" جس نے "ہمایوں لاہور" جیسے موقر ادبی ماہنامہ پر (بلا گرد و پیش نظر ڈالے) بھروسہ کرکے اسے دیوان غالب میں شامل کر لیا تھا ایسا ناقابل معافی جرم ہے تو ڈاکٹر ابو محمد سحر کی تیار کی ہوئی "فردِ جرم" بھی کچھ زیادہ اہم نہیں ہے جس کے لفظ لفظ سے جناب مالک رام کے تحقیقی کردار پر متشددانہ حرف زنی ٹپکتی ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر کا ارشاد ہے:۔

> "تحقیق کا پہلا اور بنیادی سہو یہ ہے کہ "ہمایوں" (لاہور) سے یہ غزل "دیوان غالب" میں شامل کرکے مالک رام صاحب کو اس غزل کی ثقاہت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوا۔ حالانکہ "ہمایوں" نے اس کا کوئی ثبوت پیش نہیں کیا تھا کہ یہ غزل غالب کی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ "ہمایوں" ایک معیاری اور ثقہ رسالہ تھا لیکن اس کی حیثیت سے مرعوب ہو جانا بالکل "غیر تحقیقی" تھا ایسی صورت میں اور بھی کہ اس میں یہ غزل ایک اور رسالے سے نقل کی گئی تھی۔
>
> دوسرا سہو یہ ہوا کہ اس غزل کے متعلق شبہات سامنے آنے کے بعد بھی "عارضی طور پر ہی سہی"۔ مالک رام صاحب نے ایک مشکوک ماخذ پر بھروسہ کیا اور ابتدا میں مزید تحقیق کی کوشش بظاہر اس توقع پر کی کہ اس کی "تائید" میں کوئی قوی ثبوت ملجائیگا

اس میں جب مایوسی ہوئی اور حقیقت بے نقاب
ہو کر سامنے آگئی تو اگرچہ مالک رام صاحب نے
اس غزل کو " دیوانِ غالب" سے خارج کرنے کے لئے
" فوری" قدم اُٹھایا لیکن غزل کو دیوان میں شامل
کرنے میں جو سہو ان سے ہو گیا تھا اس کا تذکرہ انھوں
نے اس انداز سے کیا کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی.
تحقیق کی یہ تیسری لغزش تھی "

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے جناب مالک رام کی جن تین "غیر تحقیقی لغزشوں" کی نشاندہی کی ہے اصولی حیثیت سے ان کو وہ "تاریخی اہمیت" نہیں دیجا سکتی جو تاثر ڈاکٹر صاحب پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر " ہمایوں" کے بارے میں یہ تسلیم کر لینے کے بعد ــــ!

" اس میں شک نہیں کہ " ہمایوں " ایک معیاری
اور ثقہ رسالہ تھا"

ظاہر ہے اس کے بعد ان کا یہ فرمانا کہ :۔

" لیکن اس کی حیثیت سے " مرعوب " ہو جانا
بالکل غیر تحقیقی تھا"

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے " معیاری اور ثِقہ " کہنے کے بعد " اعتماد " کے لفظ کو نظرانداز کر کے " غیر تحقیقی مرعوبیت " کا جو الزام جناب مالک رام پر عائد کیا ہے مجھے افسوس ہے کہ انھوں نے یہ نتیجہ نکالنے میں غلطی کی۔ کسی بھی معیاری معتبر اور ثِقہ راوی پر " اعتماد " کر لینا یقیناً " مرعوبیت " کی تعریف میں نہیں آتا۔

اب دوسری بات کہ :۔

" مالک رام صاحب نے ایک مشکوک مآخذ پر
بھروسہ کیا اور ابتدا میں مزید تحقیق کی کوشش بظاہر

اس توقع پر کی کہ اس کی کہ اس کی "تائید" میں کوئی
فوری ثبوت مل جائے ......"

کچھ عجیب سی بات کہدی ہے ڈاکٹر صاحب نے ۔ "مزید تحقیق" کی کوشش کرنا سمجھ میں نہیں آتا۔ کس "غیر تحقیقی بے راہروی" کی تعریف میں آتا ہے ؟ اور اگر وہ اپنے دعوے کی "تائید" میں بھی ہو تو بھی کونسا جرم ہے ؟ حالانکہ ڈاکٹر صاحب اس "تائید" کا کوئی پس منظر پیش نہیں کر سکے ۔ لیکن اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ جناب مالک رام نے اپنی "تائید" میں مزید چھان بین کی تو اس سے تحقیق کے بنیادی اصولوں کی کہیں سے بھی نفی نہیں ہوتی یہ تو انسان کا ایک جذبۂ فطری ہے !

جناب مالک رام کی جس تیسری "لغزش" کی طرف ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اشارہ کیا ہے ۔ وہ نتیجہ نکالنے میں بھی ڈاکٹر صاحب کسی صحت مندانہ تاثر کی ترجمانی نہیں کر سکے اول تو جناب مالک رام کا یہ اقدام کہ انھوں نے فوراً مولانا عرشی کو مطلع کیا اسکا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ اس فروگذاشت کی "اہمیت" کو دیانت داری کے ساتھ محسوس کرتے تھے ۔ پھر اپنی غلطی کا کھلا ہوا "اعتراف" کر لینا جناب مالک رام کے تحقیقی مرتبہ کو بلند کرتا ہے ۔ اور اس "اہمیت" کا آئینہ دار ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے ان کی تیسری لغزش سے منسوب فرمایا ہے ۔

یہ درست ہے کہ "بھوپال والی" اس غزل کے تمامی پس منظر میں سوائے جناب مالک رام اور ڈاکٹر گیان چند جین کے کوئی قابل ذکر نقش اب تک سامنے نہیں لایا گیا ۔ کیونکہ جناب مالک رام اس "دریافت" کا سہرا اپنے ہی سر دیکھنے کے مشتاق تھے چنانچہ انھوں نے اس غزل کے سلسلے میں اپنی صفائی دیتے ہوئے تحریر فرمایا :-

"بہر حال میں نے اس غزل سے متعلق تحقیق کرنا
ضروری خیال کیا اور ایک "دوست" کو بھوپال لکھا
کہ جوہر قریشی کا پتہ لگائیں ...."

(سہ ماہی فکر و نظر علی گڈھ جنوری ۱۹۶۱ء)

بد قسمتی سے "وہ دوست" میں ہی تھا اور ایسا گمنام۔ جس کا نام لینا جناب مالک رام نے اپنے لئے " دون مرتبت" سمجھا، بہر حال مجھے اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں ہے اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ جناب مالک رام ہی کا "تحقیقی فیض" تھا کہ اس غزل کے اصل مصنف خلیل مرحوم کا پتہ میری وساطت سے چل گیا۔

اس سلسلے میں جناب مالک رام نے اپنے اس "گمنام اور غیر معروف دوست" کو جو خط لکھے تھے پیش کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا۔

(مکتوب گرامی جناب مالک رام بنام نادم سیتاپوری
مؤرخہ ۱۰ار فروری ۱۹۵۸ء)

کرم فرمائے من۔

بہت دن سے آپ نے یاد نہیں فرمایا۔ اُمید ہے مزاج گرامی بہمہ نوع بخیر ہوگا۔ میں بھی اس طرف بہت مصروف رہا اس لئے نہ لکھ سکا۔

پیرانہ سال غالبؔ میکش کرے گا کیا

بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

یہ غزل پہلی مرتبہ "دین و دنیا" (دہلی) میں شائع ہوئی تھی۔ وہاں سے "ہمایوں" (لاہور) میں نقل ہوئی۔ میں نے اسے "ہمایوں" (اپریل ۱۹۳۹ء) سے لے کر شامل دیوان (غالبؔ) کیا۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ "ہمایوں" میں یہ منادی" (دہلی) سے نقل ہوئی ہے۔ تھوڑے دن ہوئے "ہمایوں" کا متعلقہ پرچہ دیکھنے کو ملا تو معلوم ہوا کہ میرے حافظے نے غلطی کی۔ یہ "دین و دنیا" سے لی گئی۔ "دین و دنیا" میں جب یہ

غزل شائع ہوئی ہے تو تمہید میں یہ عبارت تھی۔

مرزا غالب کی ایک غیر مطبوعہ غزل

فصیح الملک۔ خدائے سخن نواب مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ رحمۃ اللہ علیہ کی ایک غیر مطبوعہ غزل وہ متبرک روحانی تحفہ جو ابتک مرزا غالبؔ کے کسی دیوان یا ضمیمہ میں شائع نہیں ہوا اور جو امیر الملک نواب یار محمد خاں مرحوم (شوکتؔ) کے کتب خانۂ قدیم سے بذریعہ خاص حاصل کر کے "دین و دنیا" میں شائع کیا جا رہا ہے۔"

(جوہر قریشی۔ بھوپال)

اب آپ سے درخواست ہے کہ ان جوہر قریشی صاحب کا پتہ نکالئے۔ یہ کون صاحب ہیں؟ کیا واقعی یہ غزل انھیں شوکتؔ مرحوم (یار محمد خان) کے کتبخانے سے دستیاب ہوئی تھی؟ وہاں کس کتاب یا بیاض میں درج تھی۔ کیا اس کا عکس مل سکتا ہے وغیرہ۔ جملہ کوائف معلوم کر کے مطلع فرمائیے۔ آپ نے کسی خط میں لکھا تھا کہ "نسخۂ حمیدیہ" خدا بخش لائبریری پٹنہ میں پہنچ گیا ہے۔ یہ خبر پڑھ کر بہت خوشی ہوئی تھی لیکن تحقیق کرنے پر غلط ثابت ہوئی۔ کتاب (نسخۂ حمیدیہ) وہاں نہیں پہنچی۔ خدا معلوم کہاں ہے؟ آپ کو یہ سن کر مسرت ہوگی کہ "تلامذہ غالبؔ" چھپ گئی۔ جلد ساز کے پاس ہے۔ خدا چاہے تو اسی ہفتے عشرے میں شائع ہو جائے میں نے اس پر واقعی بہت محنت

کی ہے خدا کرے اسے حسنِ قبولیت نصیب ہو۔ آمین
آپ میری کوتاہ قلمی سے قطع نظر کر کے کبھی کبھی
لکھتے رہیں تو تعلق قائم رہے گا۔ ورنہ آہستہ یہ ختم
ہو جائے گا۔ پتہ محض حافظے کی بنا پر لکھ رہا ہوں
ممکن ہے اس میں تسامح ہو گیٔ ہو۔ خدا کرے خط
مل جائے۔

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

پتہ۔ جناب نادمؔ سیتاپوری

بتوسط احمد برادرس۔ چوکی امام باڑہ۔ بھوپال

(M.P.)

جناب مالک رام کا یہ خط فروری ۱۹۵۸ء کا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جناب مالک رام کو گیان چند جین کے متوجہ کرنے پر ادھر خیال آیا ہو۔ لیکن ڈاکٹر گیان چند بہت دنوں تک لاعلم رہے کہ اس غزل کا اصل مصنف کون ہے؟ اس عرصے میں میری اور ڈاکٹر گیان چند کی ملاقاتیں کم ہی رہیں کیونکہ وہ اپنے نئے مکان میں منتقل ہو چکے تھے اور ڈاکٹر گیان چند پر یہ "رازِ سر بستہ" یقیناً وسط ۱۹۵۹ء سے پہلے منکشف نہیں ہو سکا۔
ڈاکٹر گیان چند جین نے اپنے مضمون "غالب اور بھوپال" میں لکھا ہے:۔

"حال ہی میں اس کا راز سر بستہ وا ہو گیا۔ یہ غزل سب سے پہلے ماڈل اسکول بھوپال کے رسالہ "گوہرِ تعلیم" بابت اپریل ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی۔ اس "مذاق" کے مصنف اسکول کے ہیڈ مولوی جناب محمد ابراہیم خلیل تھے۔ "اپریل فول" کا عنوان دے کر نیچے

نوٹ دیا تھا۔

" ماخوذ از کتب خانہ نواب یار محمد خاں "

بوسیدہ اوراق میں غالبؔ کی یہ غیر مطبوعہ غزل ملی ہے
جسے آخری تبرکات کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

وہاں سے لے کر اوائل ۱۹۲۸ء میں رسالہ "ہمایوں" نے اسے شائع کر دیا اور "ہمایوں" سے لے کر خواجہ حسن نظامی نے اپنے اخبار "منادی" کی زینت بڑھائی۔ اس طرح اس مذاق نے بڑے بڑے ادیبوں کو "اپریل فول" بنا دیا۔

آج کل خلیل صاحب ممبر مسلم وقف بورڈ ہیں، متشرع بزرگ ہیں اور علماء میں ان کا شمار ہوتا ہے ان کے صاحب زادے ایم۔اے میں میرے شاگرد ہیں، ان کی زبانی یہ تفصیلات معلوم ہوئیں، اسی دوران صاحبزادے کے نکاح میں شرکت کے لئے "موتی مسجد" بھوپال جانا پڑا۔ وہاں خلیل صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس واقعہ کی تصدیق چاہی "مسکرا کر اعتراف کر لیا" فرمایا کہ دیوان غالبؔ میں اس غزل کو شامل دیکھ کر میں نے مالک رام صاحب کی خدمت میں تمام پوست کندہ حقیقت لکھ کر روانہ کر دی تھی۔"

(صفحات ۹۲، ۹۳ اردوئے معلیٰ دہلی غالب نمبر
شمارہ ۱، جلد ۱، فروری ۱۹۶۰ء)

میری نظر سے نہ اب تک "ہمایوں" لاہور کا مذکورہ شمارہ گزرا ہے نہ "دین و دنیا" دہلی اور نہ خواجہ حسن نظامی کے "منادی" کے وہ نمبر جن کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر

گیان چند۔ جناب مالک رام اور ڈاکٹر ابو محمد سحر کے بیانات میں سب سے بڑا تضاد یہ ہے کہ موخرالذکر دونوں افراد نے اس غزل کا "ہمایوں" سے "دین و دنیا" میں نقل ہونا "بیان فرمایا ہے۔ اور ڈاکٹر گیان چند کا فرمانا یہ ہے کہ "ہمایوں" سے خواجہ حسن نظامی نے نقل کر کے اپنے اخبار" منادی" کی زینت بڑھائی۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر گیان چند کے حافظے نے بھی اسی طرح غلطی کی جس طرح بہت دنوں تک جناب مالک رام یہ سمجھتے رہے کہ یہ "منادی" میں نقل کی گئی تھی۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس "رازِ سربستہ" کا انکشاف ڈاکٹر گیان چند کی" دریافت" سے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ مارچ ۱۹۵۸ء میں مولانا خلیل مرحوم نے نہیں بلکہ مَیں نے تمام تفصیلات جناب مالک رام کو بھیج دی تھیں اور ۲۴ رمارچ ۱۹۵۸ء کا لکھا ہوا ان کا جواب بھی مجھے موصول ہو گیا تھا۔ جناب مالک رام نے تحریر فرمایا تھا:۔

" لیجیے حضرت! مَیں نے ابھی خلیل صاحب قبلہ کی خدمت میں خط لکھا ہے" اب اس کا جواب دلوائیے"۔ مَیں نے دونوں باتوں سے متعلق لکھا ہے۔ غزل اور غالب کا خط۔ آپ کو معلوم ہے کہ ذوق ادب اور مالِ دنیا کم ہی ایک جگہ جمع ہوئے ہیں۔ اس لئے اگر انھوں نے (خلیل صاحب نے) کچھ میری بساط سے زیادہ طلب فرمایا تو باحسرت و یاس مجھے دستبردار ہونا پڑے گا اگرچہ یہ درست ہے کہ میں اپنے آپ کو ایسی چیزوں کا وارث اور حقدار سمجھتا ہوں۔ لیکن دنیا والے کب ایسی باتیں مانتے ہیں۔ بہرحال۔ حسبی اللہ و نعم الوکیل!"

خاکسار

مالک رام

پتہ:۔ جناب نادم سیتاپوری

بتوسط۔ احمد برادرس

چوکی امام باڑہ ۔ بھوپال

M.P.

اس خط سے ظاہر ہے کہ اس سلسلے کی تمام تفصیلات جناب مالک رام کو مَیں نے ہی فراہم کی تھیں۔ مولانا خلیل مرحوم نے جناب مالک رام کا جواب کئی ہفتے کے بعد میرے بے حد اصرار پر دیا تھا۔ چنانچہ جناب مالک رام اپنے ۲۳ر اپریل ۱۹۵۸ء کے گرامی نامہ میں تحریر فرماتے ہیں :۔

" مکرم بندہ ۔ جنابِ مکرم خلیل صاحب کا گرامی نامہ مجھے دہلی سے روانہ ہونے کے چند گھنٹے قبل ملا تھا۔ پچھلے ہفتے سامان کے تیار کرنے اور باندھنے اور پھر دوست احباب کی ملاقاتوں اور دعوتوں میں جو بھاگ دوڑ رہی آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ یہاں پہنچ کر بھی فرصت نصیب نہ ہوئی بہر حال آج ہی انھیں (خلیل صاحب کو) شکریہ کا خط لکھا ہے۔ انھوں نے (خلیل صاحب نے) اگرچہ معاملہ کچھ "شاعرانہ گومگو" میں رکھا۔ لیکن مفہوم تحریر یہی ہے کہ (یہ) غزل انھوں نے ۱۹۳۷ء میں "اپریل فول" کے طور پر کہی۔ اور یہ اسی زمانے میں ماڈل ہائی اسکول بھوپال کے پرچہ "گوہرِ تعلیم" میں شائع ہوئی تھی۔ ربع صدی کا زمانہ گزر گیا۔ لہٰذا سہل الحصول تو نہیں ہو سکتا لیکن اگر کہیں سے وہ پرچہ جس میں یہ غزل پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی ملجائے تو کیا کہنا؟ غالب کے خط سے متعلق جو کچھ انھوں نے

لکھا ہے وہ کچھ صاف نہیں۔ الگ کرنے سے متعلق
ایک لفظ نہیں بلکہ یہ تک تحریر نہیں فرمایا کہ اس
کا مکتوب الیہ کون ہے؟ آپ کی توجہ درکار ہے۔
"مصر" میں میرا پتہ حسب ذیل ہوگا"

والسلام والاکرام

خاکسار

مالک رام

پتہ:- جناب نادم سیتاپوری
بتوسط احمد برادرس
چوکی امام باڑہ۔ بھوپال۔ (M.P.)

میں تحقیق اور ادبی مسائل کے اس "دوستانہ پہلو" کو شخصی نام و نمود اور ذاتی پروپگنڈے سے بلند و بالا سمجھتا ہوں جن کا تعلق باہمی افہام و تفہیم سے ہو۔ اور مجھے محبی ڈاکٹر گیان چند سے یہی مخلصانہ شکوہ ہے کہ جب اس خالص تحقیقی مسئلہ پر ان کے اور جناب مالک رام کے مابین خط و کتابت ہو چکی تھی تو انھیں اس مسئلہ کو خط و کتابت ہی سے حل کرنا چاہئے تھا۔ یہ کام ان سے پہلے میں کر سکتا تھا مگر میں ایک چھوٹے سے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اس "تحقیقی اعتماد" کو گنوانا پسند نہیں کرتا تھا۔ جو جناب مالک رام کو مجھ پر تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر گیان چند کے مضمون مذکورہ بالا (غالب اور بھوپال) سے قبل اس سلسلے میں میں نے ایک لفظ بھی نہیں لکھا۔ "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" (جو بلاشبہ اکتوبر ۱۹۶۵ء کے بعد ہی چھپی) میں نے اس واقعہ کی پوری تفصیلات پیش کر دی ہیں جنھیں ملاحظہ فرمانے کے بعد بھی ڈاکٹر ابو محمد سحر نے نظر انداز کر دینا ہی مناسب سمجھا۔ حالانکہ یہ تفصیلات ان کے "حدود موضوع" سے باہر نہیں تھیں جو درج ذیل ہیں:-

"میرے دوستوں میں سے ایک صاحب تھے

بھوپال میں۔ مولانا ابراہیم خلیل مرحوم صورتاً سخت قسم کے خشک مولوی۔ مگر سیرۃً ایک "باغ و بہار" انسان۔ بڑے ہی زندہ دل۔ بامذاق اور شگفتہ دل آدمی، ان کا ادبی مذاق اتنا بلند تھا کہ بڑی بڑی ادبی صحبتوں میں چھا جایا کرتے تھے۔ شاعر تھے مگر مشاعروں کے نہیں۔ ادیب تھے لیکن شہرت سے بھاگنے والے۔ نثر بڑی ٹھوس لکھتے تھے اور اتنی ہلکی پھلکی کہ یقین کرنا دشوار تھا کہ یہ کسی ایسے شخص کی لکھی ہوئی ہے جو عربی اور فارسی کا منتہی ہے ___ بھوپال ہی میں پیدا ہوئے تھے اور یہیں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ میں کبھی کبھی ان سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا۔ منگلوارہ کے پاس ہی چھاؤنی میں ان کا مکان تھا ولبھ بھائی پٹیل کالونی کے قریب۔

مالک رام صاحب کا خط (مؤرخہ ۱۰ر فروری ۱۹۵۸ء) آئے ہوئے ایک مہینے سے زیادہ گزر چکا تھا اور اس مسئلہ کا کوئی حل ابھی نہیں نکلا تھا۔

اسی زمانہ میں حسبِ دستور ایک دن مولانا خلیل سے ملنے گیا۔ مولوی سید احمد حسن زیدی (سابق سپرنٹنڈنٹ وزارت مال ریاست بھوپال) اور میاں نظیر محمد خاں بہتر بھوپالی میرے ساتھ تھے۔ غالبؔ پر گفتگو ہونے لگی۔ مولانا (خلیل) کہنے لگے میرے والد محمد یوسف صاحب اور غالبؔ سے بڑے دوستانہ تعلقات تھے، دونوں میں باہمی خط و

کتابت بھی تھی، چنانچہ غالبؔ کا ایک غیر مطبوعہ خط آج بھی ان تعلقات کی یادگار میرے پاس محفوظ ہے۔ مولانا یہ کہہ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے اور فریم کیا ہوا فارسی کا اصل خط لا کر میرے سامنے رکھ دیا۔ یہ خط واقعی غالبؔ کا لکھا ہوا تھا اور غیر مطبوعہ بھی تھا۔ خط پر "۵ ذالحجہ ۱۲۷۳ھ یوم دوشنبہ" پڑا ہوا تھا۔ اس خط کے کسی جزو سے مکتوب الیہ کے نام کا پتہ نہیں چلتا تھا لیکن یہ خط جسے بھی لکھا گیا ہو وہ غالبؔ کا قریبی دوست ضرور تھا۔ شاید غدر شروع ہونے سے ہفتہ عشرہ پہلے لکھا گیا تھا اور مکتوب الیہ کے اس عزم و ارادے کا خیر مقدم کیا گیا تھا کہ وہ عنقریب ان سے ملنے کے لئے دہلی پہنچنے والا ہے۔

مولانا نے اس خط کے سلسلے میں ایک تعارفی مضمون بھی لکھا تھا جس میں اپنے والد اور غالبؔ سے دوستانہ روابط پر روشنی ڈالی تھی۔

یہ خط واقعی ایک نادر چیز تھا۔ دیکھ کر روحی خوشی ہوئی لیکن میں نے خط کی نقل حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ یہ غیر مطبوعہ تھا اور اس پر خود مولانا نے ایک مضمون لکھا تھا جو کہیں بھی شائع کرایا جا سکتا تھا۔

اثنائے گفتگو میں غالبؔ کے فن شعر کا ذکر چھڑ گیا اور پھر "بھوپال والی غزل" کا تذکرہ۔ مولانا مسکرائے

اور بلا کچھ کہے ہوئے گھر کے اندر چلے گئے۔ چند منٹ کے بعد واپس ہوئے تو کپڑے کے بستے میں لپٹے ہوئے کچھ کاغذات ان کے ہاتھ میں تھے۔ بستہ کھول کر انھوں نے ایک پرچہ نکالا جس پر یہی بھوپال والی غزل لکھی تھی۔ حنائی کاغذ کی کہنگی اور روشنائی کی قدامت سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ یہ مسودہ بیس پچیس برس ادھر کا لکھا ہوا ہے۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے بستہ سے "گوہرِ تعلیم" بھوپال بابت اپریل ۱۹۳۷ء کا وہ شمارہ بھی نکالا جس میں "اپریل فول" کے عنوان سے یہ غزل چھپی تھی[۱]۔

بھولے سے کاش وہ ادھر آئیں تو شام ہو
کیا لطف ہو جو ابلقِ دوراں بھی رام ہو
تا گردشِ فلک سے یونہی صبح و شام ہو
ساقی کی چشمِ مست ہو اور دورِ جام ہو
بیتاب ہوں بلا سے کن انکھیوں سے دیکھ لیں
اے خوش نصیب کاش قضا کا پیام ہو
کیا شرم ہو حریم ہے محرم ہے رازدار
میں سر بکف ہوں تیغِ ادا بے نیام ہو
میں چھیڑنے کو کاش اسے گھور لوں کبھی
پھر شوخ دیدہ بر سرِ صد انتقام ہو
وہ دن کہاں کہ حرفِ تمنا ہو روشناس
ناکام بدنصیب کبھی شادکام ہو

---

[۱] اس مضمون میں غزل کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے۔ نادم سیتاپوری

گھس مَل کے چشمِ شوق قدم بوس ہی سہی
وہ بزمِ غیر ہی میں ہوں پر اژدہام ہو
اتنی پیوں کہ حشر میں سرشار ہی اٹھوں
مجھ پر جو چشمِ ساقیٔ بیت الحرام ہو
پیرانہ سال غالبِ میکش کرے گا کیا
بھوپال میں مزید جو دو[2] دن قیام ہو
(صفحہ ۲۸۶ - ۲۸۷ - دیوانِ غالب مرتبہ مالک رام)
شائع کردہ آزاد کتاب گھر دہلی ۱۹۵۷ء

خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبات سے دیر تک میں ان دونوں چیزوں کو دیکھتا رہا۔ ایک طرف تو مجھے مولانا کی خداداد ذہانت پر حیرت تھی دوسری طرف اس بات کی خوشی تھی کہ "بھوپال والی" غزل کا بالکل غیر متوقع طور پر پتہ چل گیا۔ مولانا سے دیر تک اس دلچسپ غزل اور غالب کے طرزِ سخن پر گفتگو ہوتی رہی۔ مولانا نے اسی رنگ کی کئی اور غزلیں بھی سنائیں جو بطور "تفنن طبع" انھوں نے غالب کے رنگ میں کہی تھیں۔

اپنے گھر واپس آکر میں نے اسی وقت تمام تفصیلات جناب مالک رام کو لکھ بھیجیں اور مالک رام صاحب کو مولانا خلیل کا پتہ بھی بھیج دیا کہ اگر وہ چاہیں تو اس پتہ پر خط و کتابت کر کے اصل واقعات کی تصدیق فرمالیں۔"

(صفحات ۲۲۷ - ۲۲۹ "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" پہلا ایڈیشن)

جہاں تک مولانا خلیل مرحوم کا تعلق ہے اس کی نوعیت "اپریل فول" سے زیادہ نہیں تھی اور یقیناً مولانا عرشی کا یہ ارشاد کہ "یہ غزل نکال دی جائے اس کے شائع کرنیوالے نے "اپنے جعل" کا اقرار کرلیا" درست نہیں کہا جاسکتا اور کسی بھی نہج سے اس کا اطلاق مولانا خلیل مرحوم پر نہیں ہوتا ہے البتہ جوہر قریشی مرحوم کا دامن اس سے پاک نہیں تھا جن کی "صفائی" میں ڈاکٹر ابو محمد سحر کو اس حد تک لکھنا پڑا کہ :۔

"بالفرض مشارٌ الیہ اس مذاق کی دوسری شخصیت جوہر قریشی مرحوم ہوں تو جہاں تک میرا "علم" ہے مالک رام صاحب یا ان کے دوست نادم سیتاپوری صاحب نے ان سے رجوع ہی نہیں کیا کہ "جعل" کے زبانی یا تحریری اقرار کو آسانی کے ساتھ ان کی طرف ڈھال دیا جائے۔

رہ گئی ان کی کارگزاری کہ انھوں نے اس غزل کو "دین و دنیا" کو روانہ کردیا تو اشعار کی "مضحکانہ روش" کے علاوہ ان کی تمہید میں "فصیح الملک رحمۃ اللہ علیہ اور متبرک روحانی تحفہ" جیسے گوہر غلطاں موجود تھے جن سے جوہر یانِ سخن کو کچھ نہ کچھ اشارہ مل سکتا تھا۔

نادم سیتاپوری نے "غالب کے کلام میں الحاقی عناصر" میں اس غزل سے بحث کرتے ہوئے جوہر قریشی کے "ذاتی کردار" پر حرف زنی کی ہے۔ ان کا ذاتی کردار کچھ بھی رہا ہو لیکن اس واقعۂ خاص سے اس کا کوئی تعلق پیدا کرکے "اہلِ تحقیق" کو ان کی ذمہ داریوں

سے مشکل ہی سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ لوگوں کی
خوش مذاقی پر محض اس لئے قدغن نہیں لگائی جاسکتی
کہ محققین غالبؔ کسی ادبی شوشے سے تحقیقی غوطہ
کھاجائیں گے۔"

جہاں تک جوہر قریشی مرحوم سے رجوع کرنے کا سوال ہے ڈاکٹر ابو محمد سحر (غالب کے کلام میں الحاقی عناصر) میں اتنا تو ملاحظہ ہی فرما چکے ہوں گے کہ میں بھوپال میں جوہر قریشی نام کی کسی ایسی" ادبی شخصیت" سے متعارف نہیں تھا جس سے تحقیقی وادبی رابطہ قائم کر کے ایسی معلومات فراہم کرتا جو انھیں " جعل" کی زو سے محفوظ کرسکتا۔ جن جوھر قریشی کا پتہ میں نے جناب مالک رام کو بھیجا تھا۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ ان جوہر قریشی نے ان کے کسی خط کا جواب نہیں دیا۔ اب رہی اشعار کی " مضحکانہ روش" ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اب سے چالیس سال اُدھر کے " ناہموار تنقیدی شعور" کو ذہن میں نہیں رکھا جب ہمارا ادبی ماحول والہانہ عقیدت مندی میں رچا بسا تھا " جدید تنقید" بالکل ابتدائی منزل پر تھی ورنہ " ہمایوں" جیسے معیاری ماہنامہ کو دھوکا نہ دیا جاسکتا جس کے" حلقۂ ادارت" میں اپنے عہد کی مستند ادبی شخصیتیں شامل تھیں۔ اب رہی یہ تاویل کہ جوہر قریشی نے تمہیدی عبارت میں " فصیح الملک۔ رحمۃ اللہ علیہ۔ متبرک روحانی تحفہ" جیسے " پُر از طنز و مزاح" الفاظ کی لطافتیں سمو دی تھیں؟ اس کیلئے بھی تیس چالیس سال ادھر کے " طنز و مزاح" کی طرف مڑ کر دیکھنا پڑے گا جب یہی ملفوظات" سنجیدہ نگاری" کی جان سمجھے جاتے تھے۔ اگر پورا واقعہ ڈاکٹر ابو محمد سحر کے سامنے نہ ہوتا تو میں نہیں سمجھتا کہ ڈاکٹر صاحب ان الفاظ سے اتنا محظوظ ہوتے جتنا لطف آج اُٹھا رہے ہیں۔ تنقید کی طرح طنز و مزاح کی لطافتوں میں بھی اُتار چڑھاؤ پیدا ہوا کرتا ہے۔ ہر نئی نسل اور ہر نئی سوسائٹی نئے رجحانات لے کر آتی ہے اور پچھلے نقوش مدھم پڑ جاتے ہیں۔ مرحوم " اودھ پنچ " ہو یا" فسانۂ آزاد" انھیں آج " کلاسیکی" امتیاز تو حاصل ہے لیکن موجودہ نسل اسے کنھیا لال کپور، فرقت کاکوروی

فکر تونسوی، احمد جمال پاشا اور تخلص بھوپالی وغیرہ کے طنز و مزاح سے زیادہ لطافت بار سمجھے؟ اسے مشکل ہی سے تسلیم کیا جائے گا۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر نے جوہر قریشی کے "غیر ادبی کردار" کو اس سانحہ کی زد سے بچانے کیلئے ایک نہایت ہی عجیب و غریب بات کہہ دی ہے جسے کم از کم میں تو اصولی طور پر سمجھنے سے قاصر ہوں۔

اگر ادب و تحقیق کے پردے میں "خوش مذاقی" کے جوہر دکھانے کو اسی طریقے پر "نظر انداز" کر دینا تحقیق کے بنیادی اصول میں سمو دیا گیا تو پھر نہ مولانا عبد الباری آسی الدنی کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غیر مطبوعہ کلام غالب" پیش کر کے ہمارے ادبی ذوق کا مذاق اڑایا نہ مجدد السنہ مشرقیہ شوکت میرٹھی پر یہ الزام عائد کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غالب کے کلامِ اردو میں تحریف و تصرف کر کے غالب کے فکر و فن کے ساتھ نامناسب سلوک کیا۔ ہر شخص کو کھلی آزادی ہے جس کا جی چاہے میر تقی میر کے کلام میں ہم رنگ کلام شامل کر کے اپنی خوش مذاقی" کی داد لے لے اور جس کا جی چاہے سودا، مصحفی، آتش، ناسخ، امیر، داغ جس کا رنگ اڑا کر تحقیق و ادب کیلئے دردِ سر بن جائے۔

جن "جوہر قریشی" نے ہمایوں لاہور میں اس غزل کو "غیر مطبوعہ کلامِ غالب" لکھکر شائع کرایا، ڈاکٹر ابو محمد سحر کو اس کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ ان کے "بلند ادبی کردار" کو اس ادبی و اخلاقی جرم سے پاک و صاف سمجھیں جنھوں نے غالب سے والہانہ عقیدت رکھنے والوں کو کھلا دھوکا دینے کی کوشش کی تھی، اور مولانا خلیل کے "اپریل فول" کو اس طرح پر پیش کیا تھا کہ اہلِ تحقیق تک اپنا دامن اس "جعل" سے محفوظ نہ رکھ سکے۔

ہماری "تحقیق جدید" جس بحرانی دور سے گزر رہی ہے اس میں نہ تو روایات کو تحقیق سے جدا کیا جا سکتا ہے نہ راوی کے "شخصی کردار" کو روایات کے بنیادی اصولوں سے علیحدہ کر کے ان کی اہمیت و ضرورت سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح تحقیق و ریسرچ کو روایات کا سہارا دیئے بغیر زندہ رکھنا دشوار ہے اسی طرح راوی کے

"شخصی کردار" کو "رجال" کی کسوٹی پر پرکھے بغیر صحت مند تحقیق کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔

مجھے افسوس ہے کہ اس بنیادی اصول کی اہمیت سے ڈاکٹر ابو محمد سحر ہی نے "انحراف" نہیں کیا بلکہ اسی مسئلہ میں جناب مالک رام نے بھی یہ لکھ کر۔!

"بہر حال میں نے اس غزل سے متعلق تحقیق کرنا ضروری خیال کیا اور "ایک دوست" کو بھوپال لکھا کہ جوہر قریشی کا پتہ لگائیں اور نواب یار محمد خاں (شوکت) کے کتب خانے کا کھوج نکالیں کہ اب کہاں ہے اور دیکھیں کہ اس کی کون سی کتاب میں غزل ملی ہے۔ انھوں نے جناب جوہر قریشی سے متعلق جو کچھ لکھا وہ تو خیر "غیر متعلق" ہے ....."

(سہ ماہی فکر و نظر، علی گڑھ، جنوری ۱۹۶۱ء)

..... اصولی اعتبار سے "تحقیق" کے ساتھ کسی ذمہ داری کا ثبوت نہیں دیا۔ کیونکہ جس اہم بات کو انھوں نے "غیر متعلق" قرار دیا تھا وہ میرا ہی جملہ تھا کہ "جوہر قریشی" نام کی کسی "ادبی شخصیت" سے میں واقف نہیں ہوں ...." اگر میرا یہ کہنا اس غزل کی تحقیقی جد و جہد کے سلسلے میں "غیر متعلق اور غیر ضروری" تھا تو اس کھلی ہوئی "ادبی فریب کاری" کی جانچ کے لئے اربابِ تحقیق کون سا راستہ اختیار کریں گے؟

ادب اردو کی تاریخ میں بے شمار مثالیں ایسی ملیں گی جن میں روایت نگار کے "کردار" کو پرکھے اور جانچے بغیر بہت سی غیر معتبر اور من گڑھت روایت کو جگہ دے دی گئی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس دور کے محققین کو قدم قدم پر دشواریاں پیش آ رہی ہیں۔

ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے اس مقالے میں جس "محتاط نگاری" کا مشورہ دیا ہے

وہ تحقیق وریسرچ کا پہلا بنیادی اصول ہے اس سے روگردانی کر کے ہم یقیناً "جدید تحقیق" کی صحیح ترجمانی نہیں کر سکتے اسی کے ساتھ ساتھ نہ تو تحقیق میں روایات کی اہمیت وضرورت سے انکار کر سکتے ہیں اور نہ راوی کے "شخصی کردار" کا تجزیہ کئے بغیر اپنے اس تحقیقی سرمایہ کی حفاظت ونگہداشت کر سکتے ہیں جس کے ارتقا وبقا میں خود ڈاکٹر ابو محمد سحر اپنے دوسرے معاصرین سے پیچھے نہیں ہیں۔

قدرؔ بلگرامی

ذوالفقار

قدرؔ بلگرامی

قدرؔ بلگرامی کے متعلق جناب مالک رام تذہ "تلامذۂ غالب" میں تحریر فرماتے ہیں۔

"یہ زیدی سید تھے۔ حضرت زید بیٹے تھے حضرت سجّاد بن حضرت (امام) حسن علیہ السّلام کے۔ قدرؔ کے والد سید علی (حسینی) بن سیّد کرامت علی بلگرام (محلہ سلہیڑہ) کے رہنے والے بڑے متقی اور پرہیزگار بزرگ تھے۔

قدر ۱۲۴۹ھ (۱۸۳۳ء) میں پَیدا ہوئے "غلام حسنین" تاریخی نام ہے جو آپ کے چچا نے رکھا۔

قدر کی شادی کواتھ (ضلع شاہ آباد) میں ہوئی جو "آرہ" سے ۲۵ ۔ ۳۰ میل کے فاصلے پر ہے، یہ شادی کے بعد بلگرام اور پھر وہاں سے لکھنؤ گئے اور وہاں سحرؔ (میر امان علی) کے شاگرد ہوئے اور انھیں ایام میں مرزا فتح الدولہ برقؔ اور امداد علی بحرؔ سے عروض وغیرہ حاصل کیے چنانچہ ایک رباعی میں اپنے چاروں استادوں کا ذکر کیا ہے۔

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند
پھر غالبؔ و بحرؔ نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہوگا اے قدرؔ
بدنام کنندۂ نکو نامے چند

جب ہر طرف ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد کہیں اور جگہ نہ ملی تو محکمۂ تعلیم میں ملازمت اختیار کرلی پہلے ہردوئی میں مدرس رہے پھر وہاں سے تبدیل ہوکر کیننگ کالج لکھنؤ میں فارسی اور عربی کے اُستاد مقرر ہوئے اور بقیہ عمر یہیں بسر کردی۔ یوں ساری عمر مدرسی اور عشرت میں کٹی چنانچہ ایک مرتبہ بطور تفنن صفیر بلگرامی سے کہا کہ میری قسمت میں صرف مدرسہ پڑھانا لکھا ہے کیونکہ مدرس اور قدر کے عدد برابر ہیں۔

جب ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء) میں نظام دکن کلکتہ کی نمائش دیکھنے آئے تو نواب[۱] آغا سرور الملک بہادر

---

[۱] نواب سرور جنگ آغا مرزا بیگ غالبؔ کی حقیقی بہن چھوٹی خانم کے پوتے تھے انکے والد مرزا جواد بیگ عرف مرزا مغل بیگ ۱۸۵۷ء کے بعد اپنے بڑے بھائی مرزا عباس بیگ خان بہادر کے پاس سیتاپور چلے آئے تھے۔ نواب سرور جنگ کی ابتدائی تعلیم سیتاپور میں ہوئی پھر ...... کیننگ کالج لکھنؤ میں زیرتعلیم رہے۔ جوانی میں حیدرآباد دکن چلے گئے۔ نظام دکن محبوب علیخاں آصف جاہ کی استادی کا اعزاز حاصل کیا۔ زندگی کا آخری حصہ لکھنؤ اور علی گڑھ میں بسر کیا۔ علی گڑھ ہی میں بماہ جون ۱۹۳۲ء داعی اجل کو لبیک کہا۔ لاش علی گڑھ سے دہلی لیجائی گئی وہیں اپنے خاندانی قبرستان "مہندیوں" میں سپردِ خاک کیے گئے۔ "کارنامہ سروری" ان کی خودنوشت سوانح حیات ہے جو ۱۹۳۳ء میں مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ نادم سیتاپوری

کے ایماء پر قدر نے ایک قصیدہ عزا لکھ کر حضور نظام
میں گذرانا جس پر نظام دکن انھیں اپنے ساتھ ہی
حیدر آباد لے گئے۔ چار سو روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر
ہوا لیکن افسوس۔

عید ہوئی ذوق وے شام کو

حیدر آباد پہنچتے ہی بہت بیمار ہو گئے۔ ضیق النفس
اور ضعف معدہ کی پرانی شکایت تھی یہ عود کر آئی جب
طبیعت کسی طرح رو براہ نہ ہوئی تو اسی سال کے اواخر
میں علاج کے لئے لکھنؤ تشریف لائے۔ یہاں پہنچے تو
پہلو میں دنبل نکل آیا۔ اسی تکلیف میں بروز شنبہ
۱۴۔ ستمبر ۱۸۸۴ء (۲۳۔ ذی قعدہ ۱۳۰۱ھ)
کی سہ پہر کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ لاولد فوت
ہوئے جب حضور نظام کو وفات کی خبر ملی تو ریاست
کی طرف سے ان کی بیوہ کا دو سو روپیہ ماہانہ وظیفہ
مقرر ہو گیا۔"

(صفحات ۲۴۸۔ ۲۴۹ تلامذۂ غالب شائع کردہ
دار التصنیف و تالیف نکودر)

اس سے کچھ زیادہ تفصیلی حالات مرزا محمد عسکری بی۔ اے لکھنوی نے تحریر فرمائے
ہیں جو ہر لحاظ سے قدر بلگرامی مرحوم سے قریب تر کہے جا سکتے ہیں۔ مرزا صاحب کا
بیان ہے:۔

"میر غلام حسنین آپ کا نام۔ اور میر خلف علی آپکے
والد ماجد کا نام تھا۔ حسینی سید قصبہ بلگرام محلہ سلھڑہ
کے معزز لوگوں میں تھے ۱۲۴۹ھ میں بمقام قصبہ مذکور

پیدا ہوئے اور ایک مشہور بزرگ سید سلطان علی نے آپ کا نام تاریخی "غلام حسنین" رکھا جسکی طرف خود قدر نے اپنی ایک رباعی میں اشارہ کیا ہے۔ ؎

سو جان سے ہوں فدائے نامِ حسنین
ہے چشم و دل و جگر مقامِ حسنین
ہم روزِ ولادت سے ہوئے نام آور
تاریخی نام ہے۔ "غلامِ حسنین"

آپ شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے اور سلسلہ نسب حضرت زید شہید سے ملتا ہے سن شعور پر پہنچنے کے بعد آپ کی تعلیم شروع ہوئی اُردو کی ابتدائی کتب پڑھنے کے بعد آپ نے بلگرام ہی میں فارسی شروع کی اور اس سے فراغت کر کے عہدِ واجد علی شاہ میں لکھنؤ آئے۔ شعر و شاعری کا شوق پہلے ہی سے تھا۔ یہاں امان علی سحر سے اصلاح لینا شروع کی اور انھیں کے حلقۂ تلامذہ میں شریک ہوگئے۔ اسی زمانے میں مرزا محمد رضا برقؔ سے عروض و قافیہ پڑھا اسکے بعد میں غازی الدین حیدر کی بیگم مخاطب بہ "سرفراز محل" کی سرکار میں منشی ہوئے اسی زمانے میں برقؔ کو بھی کلام دکھانا شروع کیا۔ ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۸۵۶ء میں لکھنؤ سے بلگرام چلے آئے۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کا ہنگامہ ہوا۔ دلّی پر تباہی آئی۔ اسی زمانے میں بہت سے لوگ اپنا وطن چھوڑ کر جان بچانے کے لئے اطراف و جوانب میں نکل گئے چنانچہ مرزا غالبؔ کے بھانجے

مرزا عباسؔ بیگ اور مرزا قادر بخش صابرؔ اور نوابؔ غلام حسین شاہجہاں پوری المتخلص بہ حسینؔ آوارہ وطن ہوئے اور بلگرام میں ان کی خاطر و تواضع کی گئی اور ان آوارہ وطن اور پریشان حال مسافروں کو حتی الوسع آرام پہنچایا گیا۔ قدرؔ کی اسی زمانے میں ان سے ملاقات ہوئی اور مرزا غالبؔ کے اوصافِ حمیدہ انھیں لوگوں سے سنے۔

غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد آپ پنجاب چلے گئے فوج میں میر منشی ہو گئے۔ مگر کچھ جی نہ لگنے اور کچھ آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ سے دلی چلے آئے اور مرزا کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے مسودات اور کلام کو اصلاح کے لئے پیش کیا اور کچھ دنوں وہاں رہ کر لکھنؤ آئے یہاں شیخ امداد علی بحرؔ سے نظم پر اصلاح لینا شروع کی۔ مگر اسی دوران میں مرزا سے بھی برابر استفادہ کرتے رہے چنانچہ خود کہتے ہیں ؎

سیکھے سحر و برق سے بندش کے بند
پھر غالبؔ و بحرؔ نے بتائے پیوند
مجھ سا بھی زمانے میں نہ ہوگا اے قدرؔ
بدنام کنندۂ نکو نامے چند

غدر کے بعد ہی صوبہ اودھ کی ضلع بندی ہوئی اور بلگرام ضلع ہردوئی میں شمار کیا گیا یہی زمانہ جا بجا اسکول اور مدارس قائم ہونے کا تھا۔ اتفاق سے مرزا عباس بیگ

جو مرزا صاحب (غالبؔ) کے بھانجے تھے اس زمانے میں ضلع ہردوئی میں اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر مقرر ہوئے ان کی تحریک سے قدرؔ فارسی پڑھانے کے لئے اسکول میں مقرر ہوئے مگر چونکہ شاعری کا شوق زوروں پر تھا اور اس زمانہ میں بھی وہی اشغال جاری تھے اس واسطے اکثر طلبار کو شاعری کا ذوق پیدا ہوا اور تعلیم میں حرج واقع ہوا۔ اسی وجہ سے افسر بالا نے رپورٹ کردی اور آپ ریاضی سیکھنے کے لئے لکھنؤ بھیج دیئے گئے۔

علم ریاضی کی تحصیل کے بعد رفیق الدولہ دبیر الانشار منشی محمد ظہیر الدین خاں بہادر ظہیرؔ کی جگہ کیننگ کالج لکھنؤ میں اور ینٹل ڈیپارٹمنٹ میں مدرس فارسی مقرر ہوئے اور ۱۸۸۳ء تک یہاں رہے۔ یہیں پنڈت جٹاشنکر پانڈے سے عروضِ ہندی یعنی "پنگل" بھی پڑھا۔

۱۸۸۴ء (میں) نواب آغا مرزا بیگ (سرور جنگ) نبیرۂ غالبؔ مرحوم کی تحریک پر بنارس گئے۔ حضور نظام سابق یہاں تشریف فرما تھے اور مسند نشینی کا زمانہ قریب تھا چنانچہ قدرؔ نے بھی ایک قصیدۂ تہنیت کہا جس کے صلہ میں چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوا اور آپ کو حیدرآباد میں رہنے کا حکم ہوا۔

قدرؔ مرحوم اکثر بیمار رہتے تھے اور قدیم سے نحیف الجثہ واقع ہوئے تھے آخر حیدرآباد سے

بلگرام چلے آئے اور یہاں ۱۳۰۱ھ مطابق ۱۴ار ستمبر ۱۸۸۴ء روز یکشنبہ انتقال کیا اور میر خدا بخش کی کربلا میں دفن ہوئے جناب حمد لکھنوی نے تاریخ وفات کہی ؎

در ہزار و سہ صد و یک قدر از دنیا بشد

نیز قدر کے اس مصرع سے بھی بعض لوگوں نے تاریخ نکالی ؎

یہاں بیڑی بڑھانے کو ہر اک دیوانہ آتا ہے

مرزا غالب ان پر بہت مہربان تھے۔ تحریر کے ذریعہ سے ہمیشہ رموز و اسرار نظم و نثر سے آگاہ کرتے رہتے تھے اور نہایت مہر و محبت کا برتاؤ کیا کرتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ ان کی بیکاری کے زمانہ میں منشی نولکشور صاحب کے مطبع میں بھی ان کو رکھا دیا اور قدر مرحوم نے کچھ روز وہاں مصحح کی خدمات بھی انجام دیں۔"

(صفحات ۲۷۹ لغایتہ ۲۸۲ - ادبی خطوط غالب
مطبوعہ ایجوکیشنل پریس کراچی - ۱۹۵۴ء)

تذکرۂ تلامذۂ غالب" کے متعلق یہ ایک عام تاثر ہے کہ جناب مالک رام نے استادی شاگردی کی تمام کڑیوں کو ملانے کے لئے صرف تذکرہ کے نام (تلامذۂ غالب) ہی کو موضوع کا ماحصل قرار دے لیا اور عام طور سے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ اس پس منظر کو بھی سامنے رکھتے جس پر اس مقدس رشتے کی اساس و بنیاد قائم کی گئی تھی۔ مرزا محمد عسکری مرحوم نہ محض قدر کے دیکھنے والوں میں تھے بلکہ کیننگ کالج میں ان کے شاگرد بھی رہ چکے تھے۔ مرزا صاحب مرحوم نے قدر کی قلمی تصویر بھی پیش کی ہے:-

"وضع قطع یہ تھی کہ دبلے پتلے پستہ قد آدمی تھے
سر پر پٹے رکھتے تھے جو گردن کے پاس سے (مڑے)
ہوئے تھے اور جنکو کبھی کبھی ہاتھ سے عادتاً بل دیتے
رہتے تھے لباس میں وضعداری کا شوق۔ کپڑے
نہایت صاف اور نفیس پہنتے تھے اور صفائی کا بہت
خیال رکھتے تھے راقم الحروف جب......[۱] میں
کیننگ کالج میں پڑھنے کے لئے داخل ہوا تو میرے
محترم بزرگ مرزا خداداد بیگ برادر زادہ ڈپٹی
عباس (بیگ) مذکور مجھ کو اپنے ساتھ لے گئے
تھے ان سے اور قدر مرحوم سے تعلقات قدیمانہ
تھے انھیں دو آدمیوں کی وساطت سے میرا نام کالج
میں لکھا گیا تھا۔"

(فٹ نوٹ صفحہ ۲۸۲ ادبی خطوط غالبؔ)

قدر بلگرامی کا شمار غالبؔ کے ان گنے چُنے محبوب شاگردوں میں تھا جن کے فن سے غالبؔ کو خاص لگاؤ تھا۔ قدر بلگرامی نہ محض فارسی لغات کے ماہرین میں تھے بلکہ فن عروض پر بھی ان کی گہری نگاہ تھی۔ اتنی کہ انھوں نے ہندی عروض (پنگل) کو بطورِ خود حاصل کیا تھا۔ قدر بلگرامی کے نام غالبؔ کے جو خطوط اب تک سامنے آسکے ہیں ان سے اسکی تصدیق ہوتی ہے۔ مرزا محمد عسکری مرحوم نے لکھا ہے :۔

"مگر ــ بہ ایں ہمہ مرزا (غالبؔ) ان کو اپنا
"معین اور قوت بازو" جانتے تھے چنانچہ "قاطع
برہان" کے جواب میں جب "محرق قاطع" لکھی گئی تو
مرزا (غالبؔ) نے قدر کے جواب کی خواہش کی۔ لکھتے

---

[۱] "۱۸۰۰ء" یقیناً کتابت کی غلطی ہے ناؔدم سیتاپوری

ہیں "تم میرے یار ہو اور میری خدمت گذاری کے حقوق ہیں تم پر ـــ مجھکو مدد دو اور اپنی قوت علمی صرف کرو ـ!

"محرق قاطع برہان" میرے پاس موجود ہے مجھ سے منگواؤ میں ہر موقع پر خطا اور ذلت مولف کا اشارہ کر دوں گا ـ تم ہر فقرے کو بغور دیکھو اور بے ربطی الفاظ اور لغویت معانی کو میزانِ نظر میں تولو ـ عامی نہیں ہو عالم ہو ـ! مولوی نجف علی صاحب نے بھی تو اپنی قوتت عاقلہ سے بے اعانت غیر محرق کے جامع کی دھجیاں اُڑائی ہیں ـ تمہارے پاس دو نسخے ایک "دافع ہذیان" ایک سوالات عبدالکریم مع استفتار و اِفتاد دستخطی علمائے دہلی موجود ہیں اور اب اس کتاب کے ساتھ میرے اشارات سود مند پہنچیں گے ـ تم کو معارضہ بہت آسان ہوگا ـ مدعی کا کلام دراصل لغو ـــ پھر تمہارے پاس سرمایۂ علمی موجود ـــ اور یہ تین نسخے معقول ـ اس پر مزید علیہ ـــ اسی پر محرق اور صاحب محرق کا خاکہ اُڑ جائیگا ـ میرے اس خط کے پہنچتے ہی جواب لکھیے اور اجازت بھیجیے کہ میں نسخۂ مطبوعہ محرق بہ سبیل ڈاک بھیج دوں ـ مگر جس دن سے کہ کتاب پہنچ جائے آپ اسی دن سے اُردو زبان میں رسالہ لکھنا شروع کیجیے اور بعد اختتام مجھے اطلاع دیجیے پھر میں جیسا لکھوں ویسا عمل

میں لائیے۔"

(صفحہ ۳۸۳۔ ادبی خطوط غالب)

قدر کی رسائی غالب تک کیسے ہوئی؟ اس کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ لیکن اتنا بہر حال ثابت ہے کہ اس کی درمیانی کڑی غالب کے حقیقی منجھلے بھانجے (ڈپٹی) مرزا عباس بیگ تھے جو غدر سے پہلے نواح لکھنؤ میں پہنچ چکے تھے اور بقول مرزا محمد عسکری مرحوم غدر کی "بھگدڑ" میں مرزا عباس بیگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جب بلگرام پہنچے تو ان کی ملاقات قدر بلگرامی سے ہوئی۔

مرزا عباس بیگ کچھ زیادہ علمی و ادبی آدمی نہیں تھے پھر بھی اہل علم و فن کی قدر شناسی کی اعلیٰ صفات ان کا خاندانی ورثہ تھا۔ غدر فرو ہونے کے بعد انھوں نے قدر کی قدر افزائی کی اور غالب کی بزمِ تلامذہ میں پہنچانے کا ذریعہ بنے۔ اور یہ تعلقات بڑھتے بڑھتے اس منزل پر پہنچ گئے کہ قدر جب مالی مصائب سے دوچار ہوئے تو غالب نے منشی نولکشور سے سفارش کر کے ان کے یہاں ملازمت دلوادی۔ ایک خط میں قدر بلگرامی کو لکھتے ہیں:۔

"صاحب تم بہت دنوں سے بیکار ہو ایک جگہ مساعدت روزگار کی صورت ہے۔ تم بے تکلف میرا یہ رقعۂ دہری لے کر لکھنؤ چلے جاؤ۔ "مطبع اودھ اخبار" میں میرے شفیقِ دلی یعنی منشی نولکشور صاحب سے ملو اور یہ رقعہ ان کو پڑھوا دو اپنی نظم و نثر ان کو دکھاؤ اور اپنا مبلغ علم ان پر ظاہر کرو۔ اگر وہ اپنی مرضی کے موافق تم کو کارگذار سمجھیں گے تو مطبع کا کام تمہارے سپرد کر دیں گے مشاہرہ خاطر خواہ تم کو مقرر ہو جائے گا۔ معزز و مکرم رہو گے زندگی کا لطف اُٹھاؤ گے۔

لیکن شرط یہ ہے کہ جلد چلے جاؤ لکھنؤ تم سے نزدیک
ہے اتنی راہ کا قطع کرنا دشوار نہیں۔! اگر نوکر
نہ ہو جاؤ گے تو پھر چلے آنا۔ بخت آزمائی ہے۔"

(صفحہ ۱۸۶ — ادبی خطوط غالب)

مرزا عباس بیگ نے قدر کو محض غالب ہی سے روشناس نہیں کرایا بلکہ مرتے دم تک ان کی قدر افزائی کرتے رہے انھیں اودھ کی تعلیمی سرگرمیوں سے ایک خاص لگاؤ تھا چنانچہ غدر ختم ہونے کے بعد قدر کو اسی راستے پر لگا دیا۔

موجودہ لکھنؤ یونیورسٹی جو اپنے ابتدائی دور میں "کیننگ کالج" کے نام سے قائم کی گئی تھی اودھ کے ان تعلقداروں اور زمینداروں کی دین ہے جنھیں آج کی سیاست کاری نے "نقشِ کفِ پا" کی طرح مٹا دیا!

مرزا عباس بیگ بھی اودھ کے ایک نامور سندی تعلقدار تھے (جنھیں انگریزوں کی خیر خواہی میں "بڑا گاؤں" ضلع سیتاپور کا تعلقہ عطا ہوا تھا) اپنے دوسرے معاصرین کے ساتھ اس کالج کے قیام میں کافی سرگرم عمل رہے ان کی کوٹھی قیصر باغ (لکھنؤ) میں اس جگہ پر تھی جہاں اب کوتوالی قیصر باغ قائم کی گئی کیننگ کالج کی بنیاد اسی کوٹھی کے شمال مشرق میں اس عمارت کے اندر رکھی گئی جو مہاراجہ مان سنگھ کو دی گئی تھی۔

غدر سن ستاون کے بعد "قیصر باغ" کی عمارتوں میں جلد جلد اتنی تبدیلیاں ہوتی رہیں کہ "جانِ عالم" کا قیصر باغ دیکھتے ہی دیکھتے تعلقداران اودھ کا "میوزیم" بن گیا۔ "ساون بھادوں" کی عمارت عرصہ تک کس مپرسی کی حالت میں پڑی رہی بہت دنوں کے بعد اس میں "امیر الدولہ لائبریری" قائم ہوئی۔ "رہس منزل" مدتوں انجمن تعلقداران اودھ کے دفتر کا کام دیتی رہی۔ "پتھر والی بارہ دری" بھی انجمن کے قبضے میں پہنچ گئی۔ اور قدیم دروازے اس طرح نیست و نابود کر دیے گئے کہ آج سوائے مغربی اور مشرقی پھاٹکوں کے کسی پھاٹک کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔

قیصر باغ کی شمالی عمارتوں میں نان پارہ۔ مہیوہ اور پیاگ پور وغیرہ کو چھوڑکر تمام دوسری عمارتیں کھُد گئیں ۔ اسی سمت "رہس منزل" بھی تھی جسے منہدم کرکے "کیننگ کالج" قائم کیا گیا اور ۱۸۷۸ء میں اس کا افتتاحیہ جلسہ اسی عمارت میں منعقد کیا گیا۔ قدر بلگرامی اس کالج میں فارسی اور عربی پڑھانے پر مامور تھے چنانچہ اس افتتاحیہ تقریب میں انھوں نے ایک تاریخی نظم پڑھی جسے نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپوا کر حاضرین جلسہ میں تقسیم کیا گیا تھا خوش نصیبی سے یہ مطبوعہ نظم میرے خاندانی کتب خانے میں مل گئی ۔ یہ نظم تیرہ اشعار پر مشتمل ہے۔ مطبوعہ نظم کے چھٹے شعر کے مصرعہ ثانی

معین حال کالج ہیں یہ آگہ بخشش زر ہیں

پر سُرخ روشنائی سے قدر بلگرامی نے اصلاح و تصحیح کی ہے اور الفاظ "معین" و "آگہ" قلمزد کرکے بالائے سطر "کفیل" و "دانا" تحریر کیا ہے یعنی بشکل موجودہ یہ مصرعہ اس طرح پر بنایا گیا ہے۔

کفیلِ حال کالج ہیں یہ دانا بخششِ زر ہیں

اس قطعہ کا عنوان (قطعہ لاجواب ہدیہ سید غلام حسنین قدر ۱۸۷۸ء) تاریخی ہے اور اسکے ہر مصرعہ سے ۱۸۷۸ء نکلتا ہے۔ اصل مطبوعہ اشتہار کے اوپر سُرخ روشنائی سے کسی نے لکھا ہے۔ "منشی قدرؔ صاحب مدرس کیننگ کالج لکھنؤ قیصر باغ" !جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۷۸ء میں قدرؔ کیننگ کالج ہی سے وابستہ تھے یہ قطعۂ تاریخ بہ عنوان "تواریخ ختم تعمیر کیننگ کالج لکھنؤ کے بست وہفت مادہ دارد" "کلیات قدر" (مطبوعہ ۱۳۰۸ھ۔۱۸۹۱ء) کے صفحہ ۲۴۹ میں دو اشعار کے اضافہ کے ساتھ شامل ہے جو کلیات مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ سے نقل کرکے پیش کیا جا رہا ہے مندرجہ ذیل قطعہ میں ساتواں اور آٹھواں شعر بعد میں اضافہ کیا گیا ہے جو مطبوعہ اشتہار میں نہیں ہے۔

قطعہ لاجواب ہدیہ سید غلام حسنین قدر

سنہ ۱۸۶۷ع

گورنر جنرلِ عالی روش لارنس صاحب نے سنہ ۱۸۶۷ء
تو یہ ڈالی بنای خیر خو د کیننگ کالج کی سنہ ۱۸۶۷ء
عمارت بن چلی وہ بنتے بنتے بنگیا کالج سنہ ۱۸۶۷ء
جو باتمکین ہین کرنل ریڈ صاحب مہتمم لائق سنہ ۱۸۶۷ء
سخی دل سر مہاراجا بہادر منصفِ فائق سنہ ۱۸۶۷ء
پریسیڈنٹ مہر برج طاقت کرسی اِس آئی سنہ ۱۸۶۷ء
ہے زیبا پایہ ازبس اوج شنکر بخش راناکا سنہ ۱۸۶۷ء
ہمایون بہر ڈپٹی میرزا عباس خانصاحب سنہ ۱۸۶۷ء
ہوی میرِ عمارت نیکدل کرنل ہوئش اسمین سنہ ۱۸۶۷ء
ہین نُعمانِ خردِ ولمور صاحب نامی انجنیر سنہ ۱۸۶۷ء
انکو خوامِ جی ہوایٹ صاحب ام ای اسمین انہیر فیر سنہ ۱۸۶۷ء
سلامت یا خدا حکامِ منصور اور یہ کالج سنہ ۱۸۶۷ء

بجد و جہد کل اٹھارہ سو سٹھہ نومبر مین سنہ ۱۸۶۷ء
اگر سدِ سکندر جسطرح وقتِ سکندر مین سنہ ۱۸۶۷ء
زمانِ عدل وَرزِ بیرونٹ سر جارج کوپر مین سنہ ۱۸۶۷ء
ملک پہلونشین ہین اس رواقِ عرش ہیکر مین سنہ ۱۸۶۷ء
ہی زیبای شجاعت و گیجے سنگہ اسم دفتر مین سنہ ۱۸۶۷ء
معینِ حالِ کالج ہین یہ آگہ بخششِ زر مین سنہ ۱۸۶۷ء
ہین یہ وائس پریسیڈنٹ داخل اہل جوہر یا مین سنہ ۱۸۶۷ء
ہین سرکاری میمبر بجر دانش جملہ ممبر مین سنہ ۱۸۶۷ء
دل افزا ہی صفائی خوب ہر دیوار و ہر در مین سنہ ۱۸۶۷ء
لکھی تھی قطعِ صنعت انکی کالج کے مقدر مین سنہ ۱۸۶۷ء
سراپا فردہی کیننگ کالج ہفت کشور مین سنہ ۱۸۶۷ء
ہین جبتک نجم و مہ افلاک پر موتی سمندر مین سنہ ۱۸۶۷ء

مکمل نظم وہ لکھی ہے قدر بلگرامی نے سنہ ۱۸۶۷ء
ہین سالِ عیسوی مقصود ہر اک مصرع تر مین سنہ ۱۸۶۷ء

کیننگ کالج لکھنؤ کے سنگ بنیادی کا مطبوعہ قطعۂ تاریخ

گورنر جنرل عالی روش لارنس صاحب نے ۱۸۷۸ء
بجد وجہد کل اٹھارہ سو سرسٹھ نومبر میں ۱۸۷۸ء

قوی ڈالی بنائے خیر خود کیننگ کالج کی ۱۸۷۸ء
مگر سدِ سکندر جس طرح وقت سکندر میں ۱۸۷۸ء

عمارت بن چلی وہ بنتے بنتے بن گیا کالج، ۱۸۷۸ء
زمان عدل ورزیر ونٹ سر جارج کوپر میں ۱۸۷۸ء

جو باتمکیں ہیں کرنل ریڈ صاحب مہتمم لائق ۱۸۷۸ء
ملک پہلو نشین ہیں اس رواق عرش پیکر میں ۱۸۷۸ء

سخی دل سر مہاراجہ بہادر منصفِ لائق ۱۸۷۸ء
ہے زیبائے شجاعت دگبجے سنگھ اسم دفتر میں ۱۸۷۸ء

پریسیڈنٹ مہرِ برجِ طاقت" کے۔سی۔ایس۔آئی" ۱۸۷۸ء
کفیلِ حال کالج ہیں یہ دانا بخششِ زر میں ۱۸۷۸ء

سعید الملک[۱] امیر الدولہ والا نجم ذی ہمت ۱۸۷۸ء
یہ عالی رکن امیر حسن ہیں فتح مکرر میں ۱۸۷۸ء

---

[۱] امیر الدولہ سعید الملک سر راجہ امیر حسن خاں والئ محمود آباد راجہ صاحب محمود آباد کے جد امجد تھے۔ ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔ سحر تخلص فرماتے تھے مطبوعہ کلیات موجود ہے۔ ناؔدم سیتاپوری

به عمّانِ سخا وائس پریسیڈنٹ سابق ہیں ۱۸۷۸ء
کوئی ہمسر نہیں جاہ و عروج و شوکت فر میں ۱۸۷۸ء

ہے زیبا پایۂ ازبس اوج شنکر بخش رانا کا ۱۸۷۸ء
ہیں یہ وائس پریسیڈنٹ داخل اہلِ جوہر میں ۱۸۷۸ء

ہمایوں بہر ڈپٹی میرزا عباس خاں صاحب ۱۸۷۸ء
ہیں سرکاری یہ ممبر بحرِ دانش جملہ ممبر میں ۱۸۷۸ء

ہوئی میرِ عمارت فیکڈل کرنل ہولیش۔ آمیں ۱۸۷۸ء
دل افزا ہے صفائی خوب ہر دیوار و ہر در میں ۱۸۷۸ء

ہیں نعمانِ خرد ڈِلمور صاحب نامی انجینئر ۱۸۷۸ء
لکھی تھی قطع صنعت انکے کالج کی مقدر میں ۱۸۷۸ء

نکو خو ام۔ جی ہوائٹ صاحب۔ ام۔ اے۔ ہیں افسر یہاں ۱۸۷۸ء
سراپا فرد ہے کیننگ کالج ہفت کشور میں ۱۸۷۸ء

سلامت یا خدا حکامِ منصور اور یہ کالج ۱۸۷۸ء
ہیں جب تک نجم و مہ افلاک پر موتی سمندر میں ۱۸۷۸ء

مکمل نظم وہ لکھی ہے قدر بلگرامی نے ۱۸۷۸ء
ہیں سالِ عیسوی مقصود ہر اک مصرع تر میں ۱۸۷۸ء

قدر کو اپنے استاد سے جو والہانہ عشق و عقیدت تھی اس کی جھلک ان خطوط میں بھی پائی جاتی ہے جو غالبؔ نے قدرؔ کو لکھے تھے۔ غالب کی وفات پر قدرؔ نے جو جو دلسوز قطعۂ تاریخ لکھا ہے وہ فنّی اعتبار سے ایک معیاری قطعۂ تاریخ ہونے کے علاوہ جذبات نگاری کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں ایک غمزدہ شاگرد کے دل کی دھڑکنیں چھپی ہوئی ہیں۔

اس قطعۂ تاریخ کے ہر پہلے مصرعہ سے سن عیسوی اور مصرعہ ثانی سے سنِ ہجری نکلتا ہے:-

مرادِ حشر کیا دہلی کا خط تھا، ۱۸۶۹ء
فلک ٹوٹا یہ مجھ پر آہ ناگاہ، ۱۲۸۹ھ

مرے استاد عالی جاہ غالبؔ ۱۸۶۹ء
دوم ذی قعدہ کو اب مرگئے آہ ۱۲۸۵ھ

خدا جو خدا یاب و خدا باز ۱۸۶۹ء
فلک تمکیں فلک عصر و فلک جاہ ۱۲۸۵ھ

خدا میں مل گیا شبلیٔ خالص ۱۸۶۹ء
خدا سے جا ملا شمسِ حق آگاہ، ۱۲۸۵ھ

جہانگیرِ سخن ملکِ سخن سے ۱۸۶۹ء
ہوئے رضواں مآب الحکم لِلّٰہ ۱۲۸۵ھ

بنا تختِ رواں بس کیا جنازہ ۱۸۶۹ء
چلا دربار کو کِس شان سے وہ شاہ ۱۲۸۵ھ

کیا امرِ سفر بے میرے ہے ظلم ۱۸۶۹ء
لیا افسوس خادم کیوں نہ ہمراہ ۱۲۸۵ھ

لحد ہے حسنِ آغوشِ عروساں ، ۱۸۶۹ء
رواں بھی میرزا نوشہ کے نوشاہ ۱۲۸۵ھ

ہے اوّل چرخ وصف وسعت قبر ۱۸۶۹ء
کفن تو چاندنی وہ مستند ماہ ، ۱۲۸۵ھ

کمر کیسی جھکی اس فکر غم سے ۱۸۶۹ء
گرا ہے پشت دل پر کوہِ جانکاہ ۱۲۸۵ھ

ہے نازل آفت جاں وَے دریغا ۱۸۶۹ء
غمِ دل ہے بلا صد وائے ویلا ، ۱۲۸۵ھ

اگر ہو آب اشک غم رواں ہائے ۱۸۶۹ء
بنے وہ نخل ماتم جو کہ ہو آہ ، ۱۲۸۵ھ

یہ اشک چشم و داغِ دل ملے ہیں ۱۸۶۹ء
کروں کیا میں شمار اے میرے اللہ ۱۲۸۵ھ

کہیں یہ تیس تاریخیں جو بے حد — ۱۸۶۹ء
گئے غالب بھی۔ انکی ہے کسے چاہ — ۱۲۸۵ھ

اسی ہستی سے انس آخر کو اے قدر — ۱۸۶۹ء
ہے ساز مرگ پیش اب قصہ کوتاہ — ۱۲۸۵ھ

(صفحہ ۳۲۸ - ۳۲۹)
(کلیات قدر بلگرامی)

خود غالب کو فن تاریخ گوئی سے کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن قدر بلگرامی کو اس فن سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ انکے کلیات میں بہت سے تاریخی قطعات شامل ہیں جن میں سے چند نمونتاً پیش ہیں:۔

۱۸۶۳ء میں کانپور سے اخبار "شعلۂ طور" جاری کیا گیا۔ اس سلسلے کا قطعہ ملاحظہ ہو۔

غش ہیں بشر بیاں پہ ہے ارنی زبان پر
شعلۂ طور کانپور ۔ نور فشاں ہے دور دور
قدر شروعِ سال ہے مصرعِ عیسوی لکھو
سرمۂ چشم فکر ہے ۔ شعلۂ طور کان پور
۱۸۶۳ء

غالب کے شاگرد صدر عالم پھالوی کی وفات پر مادہ تاریخ نکالا ہے:۔

رحلت بجنا نمود صدرِ عالم
۱۲۷۹ھ

منشی ہزاری لال جواں بنارسی کو قدر ہی سے افتخار تلمذ حاصل تھا۔ ان کی

وفات پر کہا ہے۔

کیسا ہوا چٹ پٹ مرا محبوب جواں ہائے

۱۲۸۳ھ

غالب کے منجھلے بھانجے ڈپٹی عباس بیگ کے کوئی اولاد نرینہ نہیں تھی صرف ایک صاحبزادی وجیہہ النسار تھیں جنکا نکاح انھوں نے اپنے بڑے بھائی مرزا عاشور بیگ کے بیٹے مرزا محمود بیگ کے ساتھ کر دیا تھا۔ وجیہہ النسار مرزا عباس بیگ کے سامنے ہی لاولد وفات پا گئیں۔ مرزا عباس بیگ نے اپنے چھوٹے بھائی مرزا جواد بیگ (عرف مرزا مغل) کے منجھلے بیٹے فیاض بیگ کو پسر متبنیٰ بنا لیا تھا جو عام طور سے انھیں کے صاحبزادے سمجھے جاتے تھے۔ مرزا عباس بیگ کی وفات کے بعد تعلقہ "بڑا گاؤں" (ضلع سیتاپور) انھیں کو ملا اور پھر قانون تعلقہ داری اودھ کے بموجب یہ تعلقہ انھیں کی اولاد کے پاس منتقل ہوتا رہا۔ خاتمۂ زمینداری کے وقت فیاض بیگ کے پوتے مرزا وقار علی بیگ تعلقہ دار تھے جو سیتاپور میں بقید حیات ہیں۔

انھیں فیاض بیگ کی شادی میں قدر نے غالب کی مشہور زمین میں ایک تاریخی سہرا لکھا تھا جس کے ہر مصرعہ سے ۱۸۷۷ء نکلتا ہے چند شعر ملاحظہ ہوں:۔

حلقۂ شوق ہے یہ ہاتھ میں کنگنا دلخواہ ۱۸۷۷ء

دامنِ حسن ہے فیاض کے سر پر سہرا ۱۸۷۷ء

جس نے دیکھا ہو خورشید زمن کرنوں ہیں ۱۸۷۷ء

دیکھے ان کا رُخ نایاب ہٹا کر سہرا ۱۸۷۷ء

سب کے تارِ نگہِ شوق ہیں لپٹے معکوس ۱۸۷۷ء

ہے سجا رخ پہ یہ سہرے کے برابر سہرا ۱۸۷۷ء

تاج ہے روشنئ الفتِ مرزا عباس ۱۸۷۷ء

دامنِ ظلِ علمدار دلاور سہرا ۱۸۷۷ء

اس سہرے کے سرنامہ میں "تاریخِ کدخدائی مرزا فیاض بیگ ابن ڈپٹی

مرزا عباس بیگ خانصاحب بہادر" لکھا ہے جو یقیناً درست نہیں ہے مرزا فیاض بیگ ڈپٹی عباس بیگ کے سلبی پسر نہیں تھے بلکہ پسر متبنیٰ تھے۔ اور مرزا مغل بیگ کے منجھلے صاحبزادے۔ نواب سرور جنگ آغا مرزا بیگ فیاض بیگ کے حقیقی بڑے بھائی تھے۔

قدرؔ بلگرامی صاحب تصانیف کثیرہ تھے! مطبوعات میں علاوہ "کلیات قدرؔ" مذکور کے مثنوی قضا و قدر[۱]۔ شرح مجموعۂ سخن۔ شرح قصائد عرفی۔ نظم الارکان۔ ابیاتِ گلستاں۔ مصطلحات اردو۔ عطر مجموعہ کے علاوہ فن عروض پر "قواعد العروض" ان کی معرکۃ الآرا اور بلند پایۂ تصنیف ہے۔ بہت سے چھوٹے چھوٹے درسی رسائل بھی انکی فہرست تصانیف میں شامل ہیں جن کی تفصیل مجھے دستیاب نہو سکی۔

---

[۱] "مثنوی قضا و قدر" کلیات قدر مطبوعہ مطبع مفیدِ عام آگرہ ۱۳۰۸ھ میں بھی شامل ہے۔ نادمؔ سیتاپوری

رفعت شروانی بھوپالی

رفعت شروانی بھوپالی

بھوپال میں غالبؔ کے پانچ شاگرد گزرے ہیں۔ ابوالفضل رفعت شروانی۔ خان محمد خان شہیرؔ۔ نواب یار محمد خان شوکتؔ۔ حکیم معشوق علی خاں جوہرؔ۔ حکیم اشفاق حسین ذکیؔ — ! لیکن بہ اعتبار علم وفضل جو مرتبہ رفعت شروانی کو حاصل ہوا کسی ایک کے نصیب میں نہیں آیا — !

نواب یار محمد خاں شوکتؔ بھوپالی کے "شہنشاہ نامہ" میں (خاتمہ براحوال شوکت صاحب کمال) کے زیر عنوان لکھا ہے :۔

"ہمرکاب خلد آشیاں نواب سکندر بیگم صاحبہ (والیہ بھوپال) جو بہ تقریب ملاقات لارڈ صاحب بہادر آگرے کو تشریف لے گئی تھیں۔ بطریق سیر (نواب یار محمد خاں شوکتؔ) وارد شاہجہاں آباد (دہلی) ہوئے۔ جناب نجم الدولہ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں صاحب بہادر المتخلص بہ غالبؔ دہلوی سے ملاقات کی اور ان کے شاگرد ہوئے۔ شوکتؔ تخلص خسروئے شعرائے ہند سے پایا۔ مرزا صاحب ممدوح (غالبؔ) نے کہا — آپ میرے شاگرد ہوئے۔ اگر چندے یہاں رہنے کا اتفاق ہوتا تو فن شاعری میں آپ کو مہارتِ کلی حاصل ہو جاتی — مگر قیام ممکن نہیں ؟ بھوپال میں مولانا محمد عباس رفعت شروانی "مردِ فاضل ادیب

کامل" موجود ہیں۔ فارسی زبان ان کی نہایت فصیح
اہلِ زبان سے ملتی ہے بارہا اپنا کلام میرے پاس
بھیج کر مولانا (رفعت) نے مجھ سے اصلاح بھی لی
ہے۔ ان سے بہتر دوسرا شخص مجھے وہاں نظر نہیں
آتا۔ آپکو میں اجازت دیتا ہوں کہ آپ ان سے
اصلاح اپنے کلام میں لے کر میرے پاس بھیجا کریں۔
جناب موصوف (شوکت) نے ارشادِ غالبؔ پر
عمل کیا۔ "گلدستہ نرگس" اور چند غزلیں جناب
غالبؔ کے پاس اصلاح کے لئے بھیجیں۔"

(صفحات ۱۰۵—۱۰۷ شہنشاہ نامہ
مطبوعہ مطبع حسینی رامپور ۱۲۶۹ھ)

رفعت کی علمی وادبی زندگی کا بڑا حصہ تذکروں کی سرزمین "بھوپال" میں گزرا ہے۔ اس دور کے کم ہی تذکرے ایسے ملیں گے جن میں رفعت کے کچھ نہ کچھ حالات نہ ملتے ہوں۔ اب سے بارہ تیرہ سال اُدھر جب جناب مالک رام "تلامذۂ غالبؔ" کی ترتیب وتدوین کا کام انجام دے رہے تھے ان کی خواہش پر مَیں نے بھی اِس سلسلے میں کافی چھان بین کی تھی اور غالبؔ کے جن تلامذہ کا تعلق بھوپال سے رہ چکا تھا انکے متعلق "میں" بہت سی تفصیلات جناب مالک رام کی خدمت میں پیش کردی تھیں۔ اس سلسلے میں متعدد تذکروں کی ورق گردانی کا موقع بھی ملا۔ اور بہت سے مخطوطات کا بھی سرسری جائزہ لینا پڑا۔ رفعتؔ کے بارے میں جہاں تک یاد پڑتا ہے کافی تفصیلات ملک اشعرار قاضی محمد صادق اخترؔ کے تذکرہ "آفتاب عالمتاب" میں دستیاب ہوئی تھیں۔ اور اس سے بھی زیادہ تفصیلی حالات خود رفعت کی ایک تصنیف "نوردیدہ" میں ہے جسکا مخطوطہ اسمٰعیل کتاب گھر بھوپال میں محفوظ تھا۔ خود رفعت کے خاندان میں کچھ منتشر اوراق کے سوا کچھ بھی دستیاب نہو سکا۔

یہ مختصر سا ذخیرہ رفعت شروانی کے پوتے مرزا علی نقی مرحوم نے مجھے مرحمت فرمایا جواب بھی میرے پاس محفوظ ہے ۔ اس ذخیرے میں رفعت کی چند قلمی تحریروں کے علاوہ سید جعفر علی بن سید قربان علی قنوجی کی تحریر کردہ ایک نامکمل یادداشت بھی ہے جس میں رفعت کی تصانیف کی تفصیلات کے علاوہ ان کے کچھ حالات بھی ہیں جو بلاشبہ رفعت کی فراہم کردہ معلومات پر مبنی کہی جا سکتی ہیں ۔ افسوس کہ اس یادداشت کے صرف دو ہی ورق اس ذخیرے میں ہیں بقیہ تلف ہو گئے ہیں۔

اس یادداشت کے آخری حصے میں یہ چند سطور ملتی ہیں :-

" مولانا (رفعت شروانی) برنگ علامہ عبد الجلیل بلگرامی مرد آزاد منش ۔ وارستہ مزاج ۔ حکیم طبیعت سیر چشم ۔ دور اندیش ۔ پاکیزہ کیش ۔ راست گو ۔ آبرو طلب ۔ شیر دل ۔ صاحبِ طبع دراک ہیں ۔ ۲۲ ، شوال ۱۲۴۱ھ شہر کاشی (بنارس) میں پیدا ہوئے ۔ ان کے بزرگوں کا حال تذکرۂ " آفتاب عالم تاب " محمد صادق خاں اختر اور خاتمہ " نجم الثاقب " و دیگر مؤلفاتِ رفعت میں اور تذکرۂ " شمعِ انجمن " و " روزِ روشن " وغیرہ میں مفصل مندرج ہے ۔ ادبِ عربی اپنے والد (علامہ احمد یمنی) سے اور فارسی میر مشتاق فیض آبادی شاگرد علی ابن ابی طالب حزیں سے مولانا نے حاصل کیا ہے اور سیکڑوں کتابیں علوم مختلف کی مطالعہ فرمائیں ۔ جودت طبع و قوت حافظہ سے بڑی استعداد علمی حاصل کی اور مقتضائے طبیعت و جوہر فطری فنون عسکری میں مہارت تامہ انکو حاصل ہے ۔ اکثر بلاد ہند کو پھر کر

دیکھا۔ نجم الدولہ۔ دبیر الملک۔ نظامِ جنگ مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالبؔ دہلوی سے مستفید ہوئے فارسی ......[1] وصنعت تقطیل میں ان کا تخلص "سرور" اور فارسی مروج میں "رفعت" ہے۔ جب جی چاہتا ہے شعر کہتے ہیں مثلِ دیگر شعراء توجہ نہیں کرتے۔

بواسطہ خواجہ نظام الدین خلف "کالے صاحب" نبیرۂ مولانا فخر الدین۔ حضرت بہادر شاہ ثانی نے "ابوالفضلِ دوراں" اور بھوپال میں نواب امیر الملک مرحوم (والاجاہ نواب صدیق حسن خاں) نے "فرشتہ قدر" خطاب عطا کیا۔ مگر مولٰنا (رفعت) نے جزو اسم نہیں کیا۔ بلکہ مکتوم رکھا۔ بندہ نے اخفاء کا سبب دریافت کیا۔؟ فرمایا کہ بے امارت واحتشام ظاہر ہے کہ خطاب بے لطف بلکہ موجب استخفاف کا ہے اس لئے میں پسند نہیں کرتا۔

بھوپال میں بہ عزت و اعتبار سالہا سال کارہائے مختلف پر منصوب رہے۔ ۱۳۰۴ھ میں بزمرۂ منصبداراں بلا شرطِ خدمت منسلک ہوئے۔ گوشۂ عافیت میں بہ یادِ الٰہی ایّام زندگی بسر کرتے ہیں۔ سلمہ اللہ تعالیٰ! اور ان کے دو فرزندِ ارجمند ابوالقاسم محتشم وابوالحسن محترم۔ لائق۔ فائق و ذی استعداد خوش اعتقاد ہیں۔"

---

[1] کرم خوردہ۔

سید علی جعفری قنوجی کی یہ قلمی تحریر جسکا عنوان ہے " تفصیل تصانیف رفعت و حال اجمالی ابن والا فطرت رقم زدۂ خامہ و آمہ سید جعفر علی بن سید قربان علی قنوجی رقاۃ اللہ تعالیٰ اوج الکمال مقیم شہر بھوپال" اگرچہ ناتمام و نامکمل ہے لیکن چوتھے صفحے کے حاشیے پر فارسی کا جو قطعۂ تاریخ لکھا ہوا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریر شاید رفعت کی تالیف "محبوب السّیَر" میں شامل کی گئی ہے "محبوب السّیَر" رفعت کی فارسی تالیف " چارچمن" (تاریخ دکن) کا اُردو ترجمہ ہی نہیں ہے بلکہ "چارچمن" (مطبوعہ مطبع جعفری لکھنؤ .. ۱۳ھ) کی ایک ایسی بدلی ہوئی شکل ہے جس میں کچھ نئے اضافے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ کتاب ۱۳۱۴ھ تک مکمل ہو چکی تھی لیکن اس کا مخطوطہ یا مطبوعہ نسخہ میری نظر سے نہیں گذرا۔ سید علی جعفری قنوجی کے اس قطعہ تاریخ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ رفعت کے شاگرد رشید تھے۔ سید علی جعفر کا قطعہ تاریخ درج ذیل ہے۔

حضرتِ استادنا مولائے من
رفعتِ والا گہر۔ معجز سخن
در علومِ و در فنونِ عقل و نقل
مثلِ او کمتر بود اندر زمن
اندرین ایّام "محبوب السّیَر"
کرد چوں تالیف از راہِ فطن
فی البدیہہ سالِ تالیفش چنیں
کشف جعفر۔ دلربا باغِ دکن

۱۳۱۴ھ

ہندوستان کا یہ علمی خاندان نادر شاہ درّانی کے حملے کے بعد ہندوستان پہنچا تھا اور مدتوں انقلابات کے مدوجزر سے دوچار رہا۔ برسہا برس اسے چین سے ایک جگہ بیٹھنا نصیب نہ ہوا۔ جناب مالک رام نے اس خانوادۂ علم و فضل کا تذکرہ

کسی قدر تفصیل کے ساتھ "تلامذۂ غالبؔ" میں کیا ہے۔

"اِن (رفعت) کا خاندان ولایتی تھا۔ مذہباً شیعہ تھے۔ ان کے جدّ امجد جابر عبداللہ انصاری تھے آبائے کرام مدینہ سے بغداد چلے آئے اور یہاں بہت عزت واحترام سے رہے۔ پھر آب ودانہ کی کشش سے ہمدان (ایران) میں جا بسے۔ ان کے جدّ اعلیٰ مرزا محمد ابراہیم خاں ہمدانی نادر شاہ درّانی کے وزیر تھے۔ انھوں نے نادر شاہ مذکور کے ظلم وستم سے دل برداشتہ ہو کر نوکری سے استعفیٰ دیدیا اور نجف اشرف میں روضۂ مبارک کے مجاور بن گئے۔ لیکن ان کے فرزندِ رشید مستوفی الملک مرزا محمد علی خاں کے ماتھے گئی وہ قہرِ نادری کا شکار ہو گئے۔ نادر شاہ نے خود انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کا گھر بار تاراج کر ڈالا۔ ان کی اولاد اور دوسرے رشتے دار ڈر کے مارے اِدھر اُدھر آوارہ اور منتشر ہو گئے۔ ان کے بھائی مرزا محمد حسن خاں ترکِ وطن کر کے ہندوستان پہنچے اور بنارس میں رہنے لگے۔

مستوفی الملک کے بیٹے مرزا محمد تقی روپوش ہو گئے، اور "شیخ احمد" کے نام سے "شروان" میں مقیم ہو گئے۔ پھر نجفِ اشرف پہنچے اور یہاں سید مہدی طباطبائی مجتہد العصر کے سامنے زانوئے ادب تہ کیا اور ان سے فقہ وحدیث وتفسیر میں دستگاہ حاصل کی۔ چندے بعد انھیں معلوم ہوا کہ انکے چچا مرزا محمد حسن خاں بنارس

میں مقیم ہیں تو یہ بھی یہیں آ گئے لیکن ان کی آمد کے تھوڑے ہی دنوں بعد مرزا محمد حسن خاں کا انتقال ہو گیا۔ اور چونکہ شیخ محمد شروانی کی انکے ورثاء سے بن نہ آئی اسلئے یہ بنارس سے لکھنؤ چلے گئے۔ یہاں ان دنوں نواب آصف الدولہ کی حکومت تھی۔ انھوں نے انکی خوب آؤ بھگت کی اور یہ آرام و آسائش سے بسر کرنے لگے۔ کچھ مدت بعد انھوں نے "یمن" کی راہ لی۔ اور "حدیدہ" میں سکونت اختیار کی۔ یہیں ایک امیر تاجر سید محمد حیدر بغدادی کی دختر نیک اختر سے نکاح کیا جس کے بطن سے شیخ احمد شروانی پیدا ہوئے۔ یہی صاحبِ ترجمہ (رفعت شروانی) کے والد بزرگوار تھے۔

شیخ احمد (یمنی) کمالات علمی و عملی کی تحصیل کے بعد عنفوانِ شباب میں یمن سے ہندوستان آئے اور کلکتہ میں وارد ہوئے۔ یہاں حکام فرنگ کی قدر شناسی سے انھیں "مدرسہ عالیہ" (کلکتہ) میں عربی زبان پڑھانے کی خدمت سپرد ہوئی۔ اسی زمانے میں انھوں نے "الف لیلہ" مرتب کی۔ اس کی اصل غالباً کوئی مصری نسخہ تھی یہ پوری کتاب نہیں۔ انھوں نے صرف پہلی دو سَو راتوں کو درست کیا اور انھیں دو جلدوں میں ۱۸۱۴ء میں شائع کر دیا۔ یہ پہلا کلکتہ ایڈیشن ہے "سر رچرڈ برٹن" نے پوری "الف لیلہ" انگریزی میں ترجمہ کی تو اپنے ترجمہ میں اس نسخہ سے بہت مدد لی تھی۔

تھوڑے دنوں بعد انھوں نے نوکری کو خیرباد کہی اور
یہاں سے لکھنؤ چلے گئے۔ غازی الدین حیدر شاہ کا
زمانہ تھا انکے خانداں کے تعلقات دربار اودھ سے
پہلے سے تھے ہی۔ چنانچہ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا
رکن الدولہ سید محمد اسمٰعیل خاں رضوی مرشد آبادی
نے اپنی صاحبزادی ان کے حبالہ عقد میں دی۔ شیخ
محمد عباس رفعت (شروانی) اسی ازدواج کا نتیجہ
تھے۔ غازی الدین حیدر کی وفات کے بعد شیخ احمد
شروانی کا دل لکھنؤ سے اچاٹ ہوگیا وہ کان پور
بنارس۔ حیدر آباد (دکن) بھوپال۔ بمبئی وغیرہ
کی سیر و سیاحت کرتے (ہوئے) پونا پہنچے اور وہیں
۲۱ مئی ۱۸۴۰ء (۱۹ ربیع الاول ۱۲۵۶ھ) کو
رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔

شیخ احمد (یمنی) بڑے صاحب کمال شخص تھے
اپنے وقت کے "متنبی اور حریری" تسلیم کئے گئے۔ تمام
تذکرہ نویس ان کے علم و فضل کی تعریف میں رطب اللسان
ہیں متعدد تصانیف یادگار چھوڑیں۔ جن میں سے
انشائے عجب العجائب۔ نفحۃ الیمن۔ مناقب حیدریہ۔
حدیقۃ الافراح۔ تاج الاقبال فی تاریخ ملک بھوپال
مشہور ہیں۔

(صفحہ ۱۲۵۔ ۱۲۷۔ تلامذۂ غالب"۔
مالک رام ۱۹۵۷ء)

علامہ شیخ احمد یمنی اپنے دور کی ان عہد آفریں شخصیات میں سے ایک تھے جنکو

مصر۔ ایران عراق۔ بیروت اور شام و یمن وغیرہ میں درجۂ اجتہاد حاصل تھا۔ "نفحۃ الیمن" عربی ادبِ عالیہ کی ان گرانقدر تصانیف میں ہے جو مدتوں مصر۔ حجاز۔ ایران۔ عراق وغیرہ کی علمی درسگاہوں کی زیب وزینت رہی اور ادب عربی میں اسے وہی مقام حاصل ہے جو شیخ سعدی کی گلستاں۔ بوستاں کو فارسی میں حاصل رہا ہے علامہ یمنی کی تصانیف وتالیفات ان کی زندگی ہی میں مصر۔ ایران اور بیروت کے مطابع میں چھپ چکی تھیں۔ جناب سید محمد یوسف قیصر بھوپالی مرحوم تحریر فرماتے ہیں:-

"مولانا (رفعت شروانی) کے والد علامہ یمنی کی کتابیں تو ان کی زندگی میں ہی مصر اور بیروت کے مطابع میں چھپ کر شائع ہو چکی تھیں پھر بھی مولانا (رفعت) نے انکے نام سے چار کتابیں شائع کیں۔ ایک کتاب کا نام "نجم الثاقب" ہے اس میں وہ تمام خطوط اور مراسلات میں جو علمائے عرب نے علامہ یمنی کو لکھے ہیں جو مرشد و ارشاد سے معمور ہیں۔

دوسری کتاب کا نام "حمائل الادب" ہے اسمیں عرب کے ادیبوں اور شاعروں کے وہ تمام منظوم خط ہیں جو علامہ یمنی کو لکھے گئے ہیں۔ تیسری کتاب کا نام "روضۃ الصبحی" ہے اسمیں ہندوستان کے خطوط ہیں جو علامہ محترم کو لکھے گئے ہیں یہ تینوں کتابیں عربی زبان میں ہیں ان میں چھ سو بارہ (۶۱۲) خطوط ہیں جو اپنی فصاحت اور بلاغت میں "مقامات حریری" مراسلات بدیع ہمدانی اور "خطب ابن نباتہ" کے ہم پایہ ہیں۔ "حمائل الادب" کا دوسرا ایڈیشن بیروت میں بھی شائع ہوا ہے اس ایڈیشن کا ایک نسخہ سنٹرل لائبریری

(بھوپال) میں ہے۔
چوتھی کتاب "مراسلات احمدی" ہے اس میں فارسی کے خطوط ہیں جو ہندوستان اور ایران کے ادیبوں نے علامہ یمنی کو لکھے ہیں۔ ان چاروں کتابوں پر مولانا محمد عباس رفعت (شروانی) کے لکھے ہوئے مقدمات ہیں۔"

("مصنفات رفعت" مطبوعہ روزنامہ ندیم
بھوپال ۱۹؍فروری ۱۹۵۶ء جلد ۲۹۔ شمارہ ۴۱)

مجھے اپنی تحقیقی کاوش "فورٹ ولیم کالج اور اکرام علی" (شائع کردہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ ۱۹۵۹ء) کی تکمیل کے وقت کئی مخطوطات سے استفادہ کا موقع ملا جو اس وقت تک بھوپال کی سنٹرل لائبریری میں محفوظ تھے اور "روضۃ الضحیٰ المفیۃ عن الشمس السہیٰ" تو خاص طور پر پیشِ نظر رہی کیونکہ اس مجموعۂ مکاتیب میں اس عہد کے نہ جانے کتنے مشاہیر کے نادر خطوط محفوظ ملے۔

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی۔ علاّمہ دلدار علی غفران مآب شاہ رفیع الدین دہلوی۔ شاہ اسمٰعیل شہید۔ علامہ فضل امام خیرآبادی۔ علامہ تراب علی نامی خیرآبادی مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی۔ شاہ کریم عطا سلونوی۔ شاہ اجمل الہ آبادی۔ مرزا محمد حسن قتیل فریدآبادی۔ حکیم مہدی لکھنوی۔ منشی رتن چند۔ مولانا عبدالحق۔ منشی کندن لال۔ ابراہیم لوکٹ۔ شکراللہ خاں داماد ٹیپو سلطان۔ کپتان ریلی اور ہالنکس وغیرہ کے مکاتیب کتابی شکل میں ترتیب دیے گئے ہیں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے یہ مخطوطہ ایک ایسا واحد نسخہ ہے جس کی کوئی نقل کسی اور کتب خانے میں موجود نہیں ہے۔

رفعت کو علم وفضل کا ترکہ تو اپنے باپ سے ورثہ میں ملا تھا مگر "ناقدرئی ہنر" کا مقسوم اپنے استاد مرزا غالب سے مقدر رہا تھا تمام زندگی علمی وادبی مشاغل

میں بسر کی لیکن بے سروسامانی ایسی کہ۔ آج شمال میں ہیں تو کل جنوب میں آج اودھ میں تو کل دکن میں! کبھی دلی پہنچے تو کبھی بنارس!۔

چودہ برس کی عمر میں سایۂ پدری سے محروم ہوئے۔ چچا نے نگاہِ شفقت پھیر لی۔ مزاج شاعرانہ۔ شغل تاجرانہ! چند ہی روز میں تمام مایۂ وبضاعت گنوا کر ۱۲۵۶ھ ہی میں پونا سے سیہور (بھوپال) واپس آئے۔ اپنے والد کے دوست قاضی سید واصل علی کے توسط سے والیۂ بھوپال نواب سکندر بیگم کے شوہر نواب جہانگیر محمد خاں کے دربار میں رسائی پیدا کی اور جلد ہی "مقرب خاص" کا اعزاز حاصل کر لیا۔ لیکن یہ سلسلہ بھی تین سال سے زیادہ قائم و برقرار نہ رہ سکا۔ گردش تقدیر بھوپال سے سورت لے گئی۔ مگر کم نصیبی شریکِ سفر تھی تھوڑے دنوں بعد پھر سورت سے بھوپال واپس آئے اور نواب سکندر بیگم نے روک لیا۔

بھوپال ان دنوں میں اندرونی خلفشار اور خانہ جنگیوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا اسلئے رفعت شروانی کچھ زیادہ دنوں تک بھوپال میں نہ ٹھہر سکے حیدر آباد دکن چلے گئے۔ وہاں کے حالات بھی کچھ زیادہ سازگار نہ دکھائی پڑے تو عرصے تک سیر و سیاحت کرتے رہے۔ بھوپال پہنچ کر نواب قدسیہ بیگم کی سرکار سے وابستہ ہو گئے اور ۱۲۸۱ھ میں وکالت کی سند لے کر بھوپال ہی میں وکالت شروع کر دی لیکن پانچ سال کے اندر ہی درباری سازشوں کا شکار ہو گئے اور وکالت کی سند منسوخ کر دی گئی۔

نواب سکندر بیگم کے دورِ حکومت تک اسی افراتفری اور بے سروسامانی کا عالم رہا انکی وفات کے بعد جب نواب شاہجہاں بیگم سریر آرائے مملکتِ بھوپال ہوئیں تو کسی قدر سکون واطمینان نصیب ہوا۔

سیاسی استحکام کے اعتبار سے نواب شاہ جہاں بیگم کا عہدِ حکومت بھوپال کی تاریخ کا سب سے بڑا المناک دور تھا لیکن علمی وادبی لحاظ سے بھوپال نے جتنی ترقی اس زمانے میں کی اس سے پہلے نصیب نہیں ہوئی۔ اور اس پس منظر میں بلاشبہ ایک ہی شخصیت تھی والاجاہ نواب صدیق حسن خاں کی جنھیں نواب شاہجہاں بیگم

والیہ بھوپال سے شادی کے بعد اپنی علمی و ادبی حسرتیں نکالنے کا موقع مل گیا۔

والاجاہ نواب صدیق حسن خاں محض "عالم دین" ہی نہ تھے بلکہ ان کی ادبی زندگی میں بے پناہ شعری شعور بھی رچا بسا تھا۔ بھوپال کی سرزمین کو ادبی اور شعری تذکروں کی "سرزمین" بنانے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ ان کے عہد میں بھوپال دلی۔ لکھنؤ۔ رامپور اور حیدر آباد دکن کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ جگہ جگہ ادبی و شعری اذکار و تذکار۔ جگہ جگہ مشاعرے۔ جگہ جگہ علمی و ادبی چرچے۔ خود نواب صدیق حسن خاں کے یہاں بھی محفلِ مشاعرہ منعقد ہوتی تھی جس میں بھوپال کے تمام اساتذہ شرکت کرتے تھے ایسے ہی ایک مشاعرے کا تذکرہ جناب سید محمد یوسف قیصر بھوپالی مرحوم نے اپنے ایک ادبی مضمون (بھوپال کے مشاعرے) میں کیا ہے:۔

> "اس کے علاوہ نواب صدیق حسن خاں کے یہاں مشاعرہ ہوتا۔ اس میں افتخار الشعراء احسان محمد خان شہیر (نواب صدیق حسن خاں کے استاد اور مرزا غالب کے شاگرد)، مولانا محمد عباس رفعت۔ مولانا کمال الدین محمد تقی سنجر طہرانی۔ منشی عبدالکریم اوج (ایڈیٹر اخبار موج نربدا) منشی گنج بہاری لال نوش۔ مولوی یوسف علی گوپامؤی۔ جادو ناتھ مکیش۔ صابر حسین صبا (سہوانی)۔
>
> نواب صدیق حسن خاں فارسی میں توفیق اور اردو میں نواب تخلص کرتے تھے دونوں زبانوں میں مطبوعہ دیوان موجود ہیں۔ صدیق حسن خاں کے مشاعروں میں پسِ پردہ (نواب) شاہجہاں بیگم وغیرہ بھی بیٹھا کرتی تھیں۔ یہ مشاعرے تاج محل (بھوپال) کی بارہ دری میں ہوتے تھے۔ کبھی کبھی نور محل (بھوپال)

کی بارہ دری میں بھی ہوئے۔"

(روزنامہ ندیم بھوپال ۲۲ اپریل ۵۶ء ۱۹
جلد ۲۹ شمارہ ۹۲)

نواب صدیق حسن خاں کا شمار اپنے عہد کے کثیر التصانیف مصنفین میں کیا جاتا ہے کوئی تین سو کے قریب مطبوعہ کتابیں ان کے نام سے منسوب کی گئی ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس میں زیادہ تر تصانیف و تالیفات اس ادارۂ تصنیف و تالیف کی "رہین قلم" ہیں جو دفتر تاریخ کے نام سے نواب صدیق حسن خاں نے قائم کیا تھا اور اس ادارے کے سب سے زیادہ اہم اراکین میں رفعت شروانی کے علاوہ مولوی ذوالفقار احمد سارنگ پوری اور مولوی محمد یوسف گوپاموی کے نام سب سے زیادہ قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور ذی علم افراد بھی تھے جن کی تصانیف و تالیفات نواب صدیق حسن خاں اور ان کے دونوں صاحبزادوں (نواب نور الحسن خاں اور نواب علی حسن خاں) کے نام سے منسوب ہو کر شہرت پا گئیں۔

نواب صدیق حسن خاں کے نام سے جو کتابیں منسوب کی گئیں وہ زیادہ تر عربی اور فارسی کی تصانیف ہیں اور ان میں ایسی علمی کتابیں بھی شامل ہیں جو بلاشبہ نواب صدیق حسن خاں کی تصنیف کردہ ہیں لیکن ایسی کتابوں کی تعداد زیادہ ہے جو چند خطوط کے مجموعے ہیں یا عربی و فارسی قصائد وغیرہ کے انتخابات جنھیں تالیف کا درجہ بھی مشکل سے دیا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ "دفتر تاریخ" کے بعض کم مایہ معاونین کی بے احتیاطیوں کی وجہ سے ان افراد سے منسوب بعض تالیفات میں "بلا حوالے" کے دوسروں کی عبارتوں کو من و عن نقل کر کے ان سے منسوب کر دیا گیا۔ مثال کے طور پر نواب نور الحسن خاں مرحوم کے نام سے منسوب "تذکرۂ طور کلیم" میں میر غلام علی آزاد بلگرامی کے تذکرہ "سرو آزاد" کی ایک فارسی عبارت کو نواب نور الحسن خاں کی تراوش قلم بنا دیا گیا۔ اور اس عبارت کو جزو تذکرہ کرتے وقت کہیں بھی یہ ظاہر نہیں کیا گیا کہ یہ عبارت "سرو آزاد" کے مخطوطے

سے نقل کی گئی ہے۔ تذکرہ "سروِ آزاد" اس وقت تک چھپا نہیں تھا اس کا ایک مخطوطہ بھوپال پہنچا اور اس کا ایک جزو بلا حوالے کے "تذکرۂ طورِ کلیم" کا جزو بنا لیا گیا کچھ دنوں بعد مولانا شبلی کی نظر پڑی تو انھوں نے اس کا محاصرہ ایک نوٹ میں کیا۔ مولانا شبلی کا یہ نوٹ اس وقت میرے سامنے نہیں ہے لیکن "انتخاب نثر" میں ضمیرالدین قریشی نے مولانا شبلی کا یہ نوٹ نقل کیا ہے:-

"یہ بات جتا دینے کے قابل ہے کہ مولوی غلام علی آزاد نے "سروِ آزاد" جو تذکرہ لکھا ہے اس کے دو حصے کئے۔ ایک فارسی شعراء کے ذکر میں اور دوسرا ہندی یعنی بھاشا کہنے والوں کے حالات میں۔ اس دوسرے حصے کی تمہید میں لکھتے ہیں:

(شبلی نے "سروِ آزاد" کی فارسی عبارت نقل کی ہے جسے نظر انداز کر رہا ہوں) "سروِ آزاد" کا یہ حصہ ہمارے دوست نواب نورالحسن خاں خلف اکبر نواب صدیق حسن خاں مرحوم نے اپنے تذکرہ "طورِ کلیم" میں بتمامہ شامل کر لیا چنانچہ فروغِ دوم میں جہاں سے ہندی شعراء کا تذکرہ ہے عبارت تمہیدی بھی وہی "سرو آزاد" کی ہے۔ میں اس مضمون میں بلگرامی شعرائے بھاشا کا جو تذکرہ لکھوں گا اور ان کے اشعار نقل کروں گا وہ "طورِ کلیم" سے منقول ہوں گے لیکن "طورِ کلیم" کا یہ حصہ دراصل "سروِ آزاد" ہے۔ "طور کلیم" چھپ گیا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے۔"

(صفحہ ۱۰۶ - ۱۰۷ - "انتخاب نثر" شائع کردہ کتاب گھر علی گڑھ)

محبِ محترم جناب محمد اسمٰعیل رمزی ایڈوکیٹ بھوپال کا بیان ہے کہ "تذکرہ سرو آزاد" کا مخطوطہ میرے رشتے کے چچا آلِ حسن بلگرامی مرحوم نے نواب صدیق حسن خاں کی نذر کر دیا تھا چنانچہ "تذکرہ طور کلیم" کی ترتیب کے وقت اس کا فارسی دیباچہ اس سے من و عن نقل کر کے "تذکرہ طور کلیم" میں شائع کر دیا گیا اور "سرو آزاد" کا حوالہ بھی نہیں دیا گیا۔

نواب صدیق حسن خاں گذشتہ صدی کے آخر میں وفات[۵۱] پا چکے تھے "طور کلیم" انکی زندگی ہی میں چھپ گیا تھا اور "تذکرہ سرو آزاد" جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے پہلی بار ۱۹۱۰ء یا ۱۹۱۲ء میں انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا۔

ان تمام حقائق کے باوجود میں یہ تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوں کہ "سرو آزاد" کا یہ فارسی دیباچہ نواب صدیق حسن خان۔ مرزا محمد عباس رفعت شروانی۔ مولوی محمد یوسف گوپاموی یا مولوی ذوالفقار احمد جیسے ذی علم بزرگون کے علم میں بلا حوالے کے نقل کیا گیا ہوگا۔ البتہ اس غیر علمی بے احتیاطی سے "دفتر تاریخ" کی اس کارکردگی کا اندازہ ضرور ہوتا ہے جس نے بہت سی ایسی کتابیں دوسروں کے نام سے منسوب کر کے ان کی عظمت کو نقصان پہنچایا۔ اور اس اعتبار سے یہ نتیجہ نکالنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کثیر التعداد تصانیف کسی ایک شخص کے دائرۂ تصنیف میں محیط نہیں کیجا سکتیں۔

ریاست بھوپال کا "دفتر تاریخ" اپنے عہد کا ایک مفید علمی ادارہ تھا جس میں اس عہد کے بہت سے اہلِ قلم اور اہلِ کمال کو یکجا کر دیا گیا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اسکے مختلف شعبے تھے جن میں علیحدہ علیحدہ تصنیف۔ تالیف اور ترجمے کے کام انجام دئے جاتے تھے زیادہ تر کتابیں عربی اور فارسی میں شائع کی گئی ہیں اور وہ بھی والاجاہ نواب صدیق حسن خاں اور انکے صاحبزادگان سے منسوب ہیں۔ رفعت شروانی اس ادارے سے کب وابستہ ہوئے؟ اسکی تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ اتنا ضرور پتہ چلتا ہے کہ "دفتر

---

۵۱ وفات نواب صدیق حسن خاں ۱۸۸۹ء مطابق ۱۳۰۷ھ۔ ناظم سیتاپوری

تاریخ" کا سرکاری نام" دفترِ تنظیمات" تھا۔ رفعت اس ادارے کے رفقائے کار میں شامل تھے۔ سید جعفر علی قنوجی کی جس قلمی تحریر کا ذکر اوپر کیا گیا ہے اسمیں رفعت شروانی کی تصانیف کیساتھ سید جعفر علی کا ایک نوٹ بھی ملتا ہے۔

"ماسوا ان کے بیس۲۰ کتابیں اور بھی ہیں جو بعض امراء اور عزیزان و دوستان مولانا (رفعت شروانی) نے تالیف کی ہیں اور مولانا (رفعت شروانی) کی اصلاح کامل سے مزین ہوئی ہیں۔"

سید جعفر علی نے یہ "محتاط نوٹ" رفعت شروانی کی تصانیف کے سلسلے میں لکھا ہے۔ اس عہد کا اہلِ قلم اس سے زیادہ لکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن جہانتک میں سمجھتا ہوں یہ نوٹ دفترِ تاریخ کی کارکردگی کے اس پس منظر کی عکاسی کرتا ہے جو اس جاگیردارانہ نظام کا خاصہ مزاج تھا۔ اور اس وقت پر کیا منحصر؟ آج تو اس سے زیادہ مثالیں ایسی ملتی ہیں جنھیں "قلم کے مزدوروں" کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا ہے جو اس سے پہلے ہوتا رہا ہے۔

دفتر تاریخ کی روایات کچھ ایسی ہی تھیں جنکے بارے میں عام قیاس یہی تھا کہ ان تصانیف یا تالیفات کا اصل مصنّف یا مؤلف کوئی اور ہوتا تھا اور منسوب کسی اور نام سے کیجاتی تھیں۔ یہ روایت صرف بھوپال ہی کیلئے مخصوص نہیں تھی بلکہ تمام دیسی ریاستوں میں ایسا ہی رواج تھا چنانچہ جب والیہ بھوپال نواب شاہجہاں بیگم (بیگم نواب صدیق حسن خاں) کے نام سے "تاریخ بھوپال موسوم بہ تاج الاقبال" اردو میں شائع ہوئی تو عام طور سے لوگوں نے اسے رفعت شروانی سے منسوب کیا۔ حقیقت کیا تھی؟ اسکے بارے میں صحیح طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا لیکن "تاریخ اخبار رائے سین" کے مؤلف مولوی عبدالباقی نقوی نے تو یہاں تک لکھدیا:۔

"ایسا ہی حال "تاریخ بھوپال" کا ہے۔ مولانا محمد عباس صاحب (رفعت شروانی) تاریخ نگار نے بروئے کاغذات سرکاری و اخبار سماعی گھر میں بیٹھ کر

بلا تحقیق بعض واقعات تحریر کر دئے اگر کسی امر کی
تحقیقات کی نوبت پیش آئی تو حکام مفصلات سے بذریعہ
تحریر دریافت کرلیا حکام نے کسی سپاہی یا چپراسی وغیرہ
سے دریافت کر کے جواب بھیجدیا۔

مولانا (رفعت) نے کسی مقام کے معائنہ و تحقیق کی
غرض سے کوئی سفر نہیں کیا۔"

(صفحہ ۵۴۔ تاریخ اخبار رائے سین۔
مطبوعہ ہندوستانی پریس لکھنؤ)

جہاںتک سید جعفر علی قنوجی کی تیار کردہ فہرست کا تعلق ہے اس سے اتنا پتہ چلتا ہے کہ تاریخ بھوپال (اردو) کا فارسی ترجمہ رفعت شروانی نے نواب شاہجہاں بیگم کے حکم سے کیا۔ اور پھر اسکا خلاصہ بھی بیگم صاحبہ کی فرمائش پر "خلاصۃ الحالِ بھوپال" اردو میں تالیف فرمایا۔

بقول مولوی عبدالباقی نقوی اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ "تاریخ بھوپال" رفعت شروانی کی تالیف ہے تو بھی ہمیں جاگیر دارانہ نظام کے اس مقصدی طریقۂ تالیف کو نہ بھلانا چاہیئے جو سو فی صدی سرکاری اور سیاسی مقاصد کی ترجمانی کرتا تھا۔ پھر بھوپال کا جغرافیائی محل وقوع۔ رسل و رسائل کی کمی۔ نقل و حمل کی دشواریاں یہ تمام مشکلات ایک صدی ادھر کی "تحقیق" میں اتنا حائل تھیں جسکا اندازہ آج نہیں کیا جا سکتا۔

دفتر تاریخ جو اپنے دامن میں ایک عظیم علمی۔ ادبی اور تاریخی سرمایا رکھتا تھا غالباً نواب سلطان جہاں بیگم کے عہد تک سرگرم عمل رہا اس کے آخری لوگوں میں مولوی عبدالرزاق البرامکہ۔ مولوی محمد امین زبیری۔ مولوی محمد یوسف قیصر۔ علامہ محمد حسین محوی لکھنوی اور نیاز فتحپوری کا تذکرہ اب بھی بھوپال کی علمی و ادبی فضا میں گونجتا رہتا ہے۔

رفعت کے دل میں اپنے استاد سے عقیدت و محبت کا بے پناہ جذبہ تھا اور غالب کو بھی ان سے دلی لگاؤ تھا کیونکہ رفعت فارسی کے ایک نامور ادیب انشا پرداز اور مستند

اہلِ زبان تھے ۔ نواب یار محمد خاں شوکت بھوپالی نے "انشائے نورچشم" میں لکھا ہے۔

"چند سال پہلے مرزا صاحب (غالب) نے خطوط اُردو میں لکھنا اختیار کیا تھا مولانا محمد عبّاس رفعت نے بھوپال سے مرزا صاحب کو لکھا کہ میں فارسی عنایت نامے کا مشتاق ہوں ۔ جناب مرحوم (غالب) نے انکو خط فارسی میں تحریر فرمایا جو کہ ہر دو خط منظوم و منثور کلیات دیوان و انشائے جناب موصوف میں میری نظر سے نہیں گذرے ۔"

(انشائے نورچشم ۔ صفحہ ۴۶[۱])

رفعتؔ نے اپنی تصنیف "نور دیدہ" میں اپنے استاد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"نجم الدولہ ۔ دبیر الملک مرزا اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالب اکبر آبادی المولد دہلوی المسکن است ۔ نسبتش بہ افراسیاب و جمشید منتہی میشود ۔ دیوانِ اُردو و دیوان کلیات فارسی ۔ مہر نیم روز و ماہ نیم ماہ ۔ پنج آہنگ ۔ دستنبو ۔ قاطع برہان ۔ تیغ تیز ۔ عود ہندی ۔ درخش کاویانی ۔ گوہر افشاں ۔ قادر نامہ ۔ پساچین (سبد چین) مشتمل قصائد و اشعار کہ بعد طبع کلیات خود فرمودہ است رواں شیریں اُردوئے معلّا ۔ دلائل اعجاز فضل و بلاغتش ہستند ۔ راقم الحروف غائبانہ بدید کلام می بینش معتقد گشت و از دور سر فرو د آوردہ در حلقۂ شاگردان زانو شکست ۔ جناب ممدوح (غالب)

[۱] بحوالہ سہ ماہی اُردو کراچی غالب نمبر ۔ شمارہ ۱، جلد ۲۵

ازراہِ اخلاقِ بے پایاں مانند کلمائے اشراقیان چند مرتبہ توجہ دلی فرمود و اشعار بندہ را کہ ذریعہ بنالیش نامہ ہا فرستادہ بودم اصلاح نمود۔ یک دو شعر میر عماد در صفت آں سلالہ امجاد راست بے کم و امرور بہ شیریں دہنی چوں تو یکے نیست حقاکہ چنین ست و دریں ہیچ شکے نیست زاں دم کہ بیار است بست خوان ملاحت بر ہیچ بے نیست کہ حق نمکے نیست و چوں بکشش آب و دانہ اتفاق رفتم بہ دہلی شد از ملاقات جناب غالبؔ بہرہ ور شدم و مورد الطاف شان گشتم۔

دوم ماہ ذی قعدہ سنہ ۱۲۸۵ھ در دہلی برحمت حق پیوست و در خلد بریں زیر سایۂ طوبیٰ نشست۔"

غالبؔ کی وفات پر رفعت نے جو قطعہ تاریخ لکھا تھا اس کے چند شعر درجِ ذیل ہیں:۔

جان ارباب سخن غالبؔ عالی ہست
ناظم سحر بیان ناثر والا فطرت
رشک فردوسی و خاقانی و عالی و کمال
ثانی خسرو و سعدی و حزین و شوکت
ابر مدرار کمالات و فرات و دانش
ماہرِ علم و معانی و بیان و حکمت
ازجہاں کرد سفر سوئے ریاض رضواں
گفت عباس کہ "شایانِ سریر جنت"
۱۲۸۵ھ

(صفحہ ۶۸ تذکرہ فرح بخش)

مالی اعتبار سے رفعت کی زندگی کچھ ایسی کامیاب زندگی نہیں کہی جاسکتی لیکن بھوپال کی ادبی اور مجلسی زندگی میں اس خاندان کو ہمیشہ باوقار مقام حاصل رہا۔ "پیر دروازے" سے صدر منزل (بھوپال) جاتے ہوئے "یمنی منزل" کا جو عظیم پھاٹک لگا ہوا ہے اس کے اندر کی بہت سی عمارتیں اب منہدم ہو چکی ہیں لیکن ان کھنڈرات سے اب بھی ایک ایسی عظمت و جلال ٹپکتا ہے جو اس مکان کے مکینوں کی بلندی اور رفعت کا آئینہ دار ہے۔

رفعت شروانی کے دو صاحبزادے تھے ابوالقاسم محتشمؔ اور ابوالحسن محترمؔ دونوں ذی علم اور صاحبِ تصنیف و تالیف۔

ابوالقاسم محتشمؔ رفعت شروانی کی وفات کے بعد اپنے باپ کی جگہ پر "دفترِ تاریخ" کے مہتمم مقرر ہوئے۔ اور ابوالحسن محترمؔ نائب جیلر کے عہدے پر ممتاز ہوئے۔ مرزا علی نقی مرحوم جو بھوپال میں میرے ہمسائے تھے محتشم کے صاحبزادے تھے۔ ابوالحسن محترم کے پانچ صاحبزادے تھے۔ جن میں مرزا احمد تقی بیرسٹر کا شمار بمبئی کی نامور ہستیوں میں تھا۔ ایک دوسرے صاحبزادے مرزا علی اصغر حیدرآباد دکن چلے گئے تھے ان کی اولاد وہیں رہ بس گئی۔ پتہ نہیں کہ اس خاندان کے افراد حیدرآباد ہی میں ہیں یا کہیں اور ترک سکونت کر گئے۔ محترم کی ایک صاحبزادی برکت النساء دس بارہ سال اُدھر تک بقیدِ حیات تھیں اور یمنی منزل (بھوپال) ہی میں رہتی تھیں۔

رفعت شروانی نے ۱۳۱۵ھ (۹۸-۱۸۹۷ء) میں بمقام بھوپال وفات پائی اور "کربلا" (متصل ریڈیو اسٹیشن بھوپال۔ احمد آباد روڈ) میں سپرد خاک کیے گئے۔

میرزا محمد تقی کمال الدین سنجر طہرانی[1] نے حسبِ ذیل قطعاتِ تاریخ لکھے تھے جو

---

[1] میرزا محمد تقی کمال الدین سنجر طہرانی گذشتہ صدی کی اس انقلابی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں جنھیں ایران سے بجرمِ بغاوت نکال دیا گیا تھا۔ اور وہ ہندوستان چلے آئے تھے

(باقی صفحہ آئندہ پر)

ان کے قلم سے لکھے ہوئے میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ دونوں قطعات پہلی بار شائع کئے جا رہے ہیں۔

آں ابوالفضل محمد عباس
جرزی رفعتِ با استقلال
بسوئے ملک بقا عزمِ رحیل
کرد از دارِ فنا شد رحّال
طائرِ روح سر تفش امروز
بکشود است بہ جنّت پر و بال
رفت بکشود بفردوس بریں
رفعت امروز بصد جاہ وجلال
دلِ یاراں و عزیزاں ہمہ را
سوخت از آتشِ حرمان وملال
گفت تا داعیٔ حق را لبیک
گشت از رحمتِ حق مالامال
عوضِ مہر علیؓ و آتش
یافت جنت زخدائے متعال
بندۂ آلِ محمدؐ عباسؓ
در جناں گشت قرینِ افضال
حَمدَ لِلّٰہ بریاضِ جنّت
پس مقرّب شدہ بر احمدؐ و آل

بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ:۔ اپنے دور کے ممتاز ادیبوں میں تھے اور فارسی کے بے مثل شاعر۔ مدتوں۔ بھوپال۔ حیدر آباد دکن اور رامپور وغیرہ میں رہے۔ تخمیناً ۱۹۱۰ء میں وفات پائی غالباً رامپور (یو۔پی) میں آسودۂ خواب ہیں۔ نادم سیتاپوری

باکمال و شغف و جد و طرب
محرمِ یار شد بزمِ وصال
پے تاریخ ..... سنجر گفت
آہ از مرگِ ابوالفضل کمال
۱۳۱۵ھ

آں دریغا زمرگِ مولٰنا
کہ خرد بود در برِ اُو خرد
جرِ کامل محمّدِ عبّاس
رفت از ایں سرائے فانی بُرد
گلِ رخسارش از سمومِ اجل
در گلستانِ روزگار فسُرد
گفت لبیک رفعت از تہِ دل
جاں بہ جان آفرینِ خویش سپُرد
جامِ عمرش زدست بُرد وفات
کشت خالی رضاف پُر از دُرد
گلِ رخسارۂ ابوالفضلے
از خزاں کارئ اَجل پژمُرد
از پے سال رحلتش سنجر
گفت صد وائے بوالفضائل مُرد
۱۳۱۵ھ

رفعت کی تصانیف وتالیفات جو ابتک دستیاب ہوسکی ہیں ان کی تعداد پچاس سے زیادہ ہے۔ وہ کتابیں ان کے علاوہ ہیں جو ان کے تعاون واشتراک سے پایۂ

تکمیل تک پہنچ کر دوسروں کے نام سے منسوب ہوئیں۔

سید جعفر علی قنوجی نے رفعت کی تصانیف کی جو قلمی فہرست ترتیب دی ہے وہ بہت حد تک مفصل کہی جا سکتی ہے اس لئے انھیں کی قلمی یادداشت سے من وعن نقل کی جا رہی ہے۔

۱۔ قیصر نامہ — تاریخ روم فارسی۔ مشعر حال سلاطین عثمانی تا جلوس عبدالعزیز خاں۔ یہ کتاب ۱۲۸۰ھ میں مطبع نظامی کانپور میں چھپی بعد ازاں ۱۳۰۰ھ میں مولانا عباس (رفعت) نے "سلطان نامہ" مشعر حال شہادت سلطان عزیز و جلوس مراد خاں۔ بعدہٗ جلوس سلطان عبدالحمید ثانی تا واقعہ "جنگ پلونا" تحریر کیا۔ مرزا محمد شیرازی سوداگر (کتب) بندر بمبئی میں دیباچہ "قیصر نامہ" چھوڑ کر "سلطان نامہ" کا دیباچہ لکھ کر اخیر کتاب میں وقائع سلطان نامہ کو ملحق کر دیا اور بعض جگہ ایک دو لفظ بدل کر عبارت موافق محاورۂ حال اہلِ ایران بنا کر مکرر دو تین مرتبہ چھاپا اور ایران بھیجکر فروخت کیا۔ اب "قیصر نامہ" کم یاب ہے اور "سلطان نامہ" بہ سبب طبع مکرّر ریسّر ہے۔

۲۔ تزک افغانی — اُردو۔ اس میں نسب و تفصیل اقوام اور نوابان قوم افغان کا حال ہے یہ کتاب مطبع مفید عام آگرہ میں چھپی ہے اب کم یاب ہے۔

۳۔ تاریخ بھوپال موسوم بہ تاج الاقبال (فارسی ترجمہ) — اُردو میں نواب شاہجہاں بیگم صاحبہ والیۂ بھوپال نے لکھی پھر مولانا عباس (رفعت) نے بہ فرمانِ بیگم صاحبہ فارسی میں لکھی پھر انگریزی میں لکھی گئی اور پھر کتاب چھپ کر مشتہر ہوئیں پھر "خلاصۃ الحال بھوپال" ملخص تاریخ مذکور

بحکم بیگم صاحبہ اردو میں مولانا (رفعت) نے رقم کیا۔ مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ گیا ہے۔

۴۔ چار چمن — تاریخ دکن فارسی میں ۱۳۰۰ھ (میں) مولانا نے رقم کی مطبع جعفری لکھنؤ میں چھپی۔ بعدہٗ ۱۳۱۴ھ اُردو میں مع اضافہ مطالب بار دیگر غلط تالیف ہوئی "محبوب السیر" اُسکا نام ہے۔

۵۔ تاریخ آلِ امجاد — فارسی مشعر حال دوازدہ امام علیہم السّلام۔ عمدہ و معتبر کتاب ہے۔ مطبع انصاری دہلی میں چھپی ہے۔

۶۔ تاریخ سیلان
۷۔ تاریخ اندلس — } یہ دونوں تاریخ زبان اردو میں ہیں۔

۸۔ تاریخ دلچسپ — بزبان اُردو۔ اس میں حالات بعض بلاد و وقائع عجیبہ و غریبہ دیار و امصار کا حال مرقوم ہے۔

۹۔ تاریخ نفیس — انیس الجلیس بہ تتبع تاریخ نگارستان قاضی احمد غفاری مشتمل بر حالِ غرائب اشیاء و اشجار عجیب الاثر وغیرہ فارسی میں نادر کتاب ہے ملخص اس کا اردو میں لکھا گیا ہے۔ یہ چاروں کتابیں (لغایت ۶ تا ۹) مطبع انصاری دہلی میں طبع ہوئی ہیں۔

۱۰۔ تارِیخ قلائدالجواہر — مؤرّخ بہ "تاریخ نکو" فارسی۔ مشعر بر حال قوم بوہرہ و ائمہ شیعہ اسمٰعیلیہ۔ بندر بنبئی (بمبئی) میں مرزا محمد شیرازی مالک الکتاب سوداگر نے چھاپی ہے۔

۱۱۔ نقد رواں — تاریخ سکّہ ہائے شاہان۔ معہ شبیہہ زرہائے .... مطبع شاہجہانی بھوپال میں چھپی ہے۔

۱۲۔ گرامی نامہ — فارسی تاریخ شاہان تیموریہ۔

۱۳۔ آئین بہین (ترجمہ)	دستور العمل سلاطین فارسی۔ یہ ایک کتاب کہنہ سنسکرت کا ترجمہ ہے پھر اُردو میں ترجمہ ہوا۔ مطبع مفید عام آگرہ میں چھپا۔
۱۴۔ آئین محبوب۔	فارسی ــــ قواعد سلطنت ــــ عمدہ آئین اس مذکور ہیں۔
۱۵۔ چشمۂ نوشش	فارسی۔ اُردو میں بھی مترجم ہے ۔ یہ بھی سلطنت کا قانون ہے ایک قصۂ فرضی کے پیرائے میں۔
۱۶۔ داستاں باستاں	فارسی۔ اس میں بعض بلاد مالوہ کا حال ہے۔
۱۷۔ نور دیدہ ۱۸۔ روان افزا ۱۹۔ نشاط افزا	ہر سہ زبان فارسی۔ ان میں تاریخی حال و نکات علم و ادب و اشعار منتخب مسطور ہیں۔
۲۰۔ سرّ من رائے	فارسی۔ اس رسالے میں حقیقت و کیفیت علم جفر مندرج ہے۔
۲۱۔ قبات القیاس	مراسلات فارسی عباس (رفعت شروانی)
۲۲۔ ہمایوں نامہ	مراسلات فارسی عبّاس (رفعت شروانی) انشائے فارسی۔
۲۳۔ گلدستۂ انشائے فارسی	اس میں دبیران نامی کے مکاتیب بنام مولانا رفعت جمع ہیں۔
۲۴۔ آرسی پارسی	فرہنگ لغات دری فارسی کی ہے اور اسی نام سے موسوم دوسرا رسالہ ہے اُس میں لغات عربی۔ ترکی۔ انگریزی وغیرہ جو فی زمانہ داخل و شامل محاورۂ خاص و عام اہل ایران میں بقدر دریافت فراہم ہیں۔

۲۵۔ بہارِ گُل
۲۶۔ ساغرِ مُل } فارسی۔ اسمیں لطائف وظرائف کلام شعراء مذکور ہیں۔

۲۷۔ گلِ نسرین — فارسی۔ اسمیں چند حکایات منشور ہیں۔

۲۸۔ لخلخۂ عبہری — فارسی۔ اسمیں بعض وقائع تاریخی کا بیان ہے۔

۲۹۔ تقریر دلپذیر
۳۰۔ جواب شافی۔ بیان کافی
۳۱۔ جواب باصواب } یہ تینوں کتابیں علم کلام مناظرہ فریقین میں ہیں۔

۳۲۔ جواہر خانہ — یہ ایک مجموعہ ہے اس میں عربی۔ فارسی۔ اُردو زبان میں اکثر حالات تواریخ وفن ادب ودیگر علوم متعارفہ کے ایسے مرقوم ہیں جو بہت مفید ہیں اس کی پانچ مجلد بقدر ہشت صد ورق مولانا (رفعت) لکھ چکے ہیں اور مجلد ششم جاری ہے ان کی زندگی تک تحریر اس کے مجلدات کی جاری رہے گی۔

۳۳۔ راح روح
۳۴۔ ازناب
۳۵۔ سرداد سرور
۳۶۔ سلک گوہر
۳۷۔ در نجف } یہ پانچ مثنوی مولانا (رفعت) کی موسوم بہ "خمسۂ عباسی" ہیں۔ انکی نظم فارسی نہایت فصیح وبلیغ مشتمل بر مراسلات منظوم وحکایات ومدائح ودیگر اصناف سخن پر۔

۳۸۔ خیر العمل — یہ فارسی قواعد نماز شیعہ امامیہ کے بیان میں۔ بحوالہ احادیث معتبر وصحیح مسطور ہیں۔

۳۹۔ مجرّبات عبّاسی — اسمیں اکثر امراض کے مجرّب نسخے ہیں۔

۴۰۔ گلِ صد برگ — اسمیں ۱۰۵ رقعہ فارسی بلا آمیزش لفظ عربی ہیں۔

۴۱۔ داستانِ شنگرف — اس میں "فسانۂ عجائب" اُردو کا قصہ بزبانِ فارسی دری بے آمیزش لفظ عربی مرقوم ہے۔

۴۲۔ منظوماتِ رفعت — اس میں قصائد و اشعار فارسی مولانا رفعت کے جمع ہیں۔

۴۳۔ تابوتِ سکینہ — اس میں ادعیہ و تعویذات سریع الاثر مکتوب ہیں۔

۴۴۔ رازداں — اس میں بعض عمدہ مضامین مسطور ہیں۔

۴۵۔ عباس نامہ — یہ رسالہ نظم مثل "نصاب الصبیان" ہے

۴۶۔ زینۃ الانشاء
۴۷۔ انسان الانسان
۴۸۔ بستر الناظرین
۴۹۔ سبحۃ الصجد

یہ چاروں رسائل عربی مقفیٰ ہیں۔ ان میں مراسلات عربی ہیں جو مولانا (رفعت) نے اربابِ فضل و کمال کو لکھے ہیں۔ انکے ملاحظہ سے مولانا کی دستگاہ کامل وانشاپردازی لسان عربی میں معلوم ہوتی ہے کہ کس قدر ہے۔؟

۵۰۔ دلکشا — فارسی میں ایک مختصر رسالہ نکات ادبیہ کا ہے۔

اس کے سوا چار کتاب (کتابیں) اور انکی فراہم کی ہوئی ہیں۔

(۱) نجم الثاقب — اس میں مراسلات عربی مؤلف "نفحۃ الیمن" و عجائب العجائب والد مرحوم مولانا عباس (رفعت) کے ہیں۔

(۲) حمائل الادب — اس میں علمائے عرب کے منثور منظوم خطوط ہیں بنام مؤلف "نفحۃ الیمن" (علامہ احمد یمنی)

(۳) روضۃ الصبحیٰ — اسمیں علماء نامی ہندوستان کے مکاتیب بنام مؤلف "نفحۃ الیمن" ہیں اور ان تینوں کتابوں کی عبارت فصاحت و بلاغت ولطافت میں شبیہ عبارت "مقامات حریری" و مراسلات ہمدانی وخطب ابن نباتہ ہیں اور جملہ خطوط (۶۱۲)

(۴) مراسلات احمدی — اس میں خطوط فارسی "صاحبِ نفحۃ الیمن" اور دیگر دیران

نامی ہند کے ہیں۔

ان چاروں کتاب (کتابوں) کا دیباچہ مولانا محمد عباس (رفعت) نے لکھا ہے۔

(از تحریر قلمی سید جعفر علی قنوجی)

سید جعفر علی قنوجی کی تحریر کی ہوئی جو فہرست (انھیں کے الفاظ میں) پیش کی گئی ہے اس پر کوئی سنِ تحریر درج نہیں ہے لیکن میرا قیاس یہ ہے کہ یہ فہرست رفعت شروانی کے ایماء اور ہدایت پر ترتیب دی گئی تھی۔ اور انھیں کے ذخیرے میں محفوظ رہی۔ اس فہرست کے صرف چند صفحات مجھے دستیاب ہوئے جو مفصل تو ہیں مگر مکمل نہیں کہے جا سکتے۔ ابھی چند سال ادھر تک رفعت کے دیکھنے والے معتبر بزرگ بھوپال میں موجود تھے جنکا کہنا تھا کہ رفعت کا قلم سوتے جاگتے ہر وقت چلا کرتا تھا۔ سفر میں۔ حضر میں کہیں ہوں تصنیف و تالیف کا کام جاری رہتا بیان کیا جاتا ہے کہ رفعت کا مشغلہ تصنیف و تالیف ایسا تھا کہ ایک وقت میں کئی کئی کتابیں مختلف موضوعات پر لکھتے رہتے تھے۔

مندرجہ بالا فہرست کے علاوہ میرا خیال ہے کہ بہت سی ایسی کتابیں اور بھی ہوں گی جو اس فہرست میں شامل نہیں ہیں فارسی کے علاوہ اردو میں بھی شعر کہتے تھے مگر اپنی شعری زندگی کو کبھی اپنی علمی زندگی سے وابستہ کرنے کی کوشش نہیں کی یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ادبی رسائل اور گلدستے رفعت کے اُردو اور فارسی کلام سے خالی نظر آتے ہیں۔ بھوپال میں مشہور تھا کہ مرنے سے پہلے انھوں نے اپنی بیاض (یا بیاضیں بھوپال کے "بڑے تالاب" میں ضائع کر دیں۔ رفعت کی بیشتر کتابیں قلمی اور غیر مطبوعہ ہیں جن کے متعدد مخطوطے پندرہ سولہ سال ادھر تک بھوپال کے مختلف کتب خانوں میں بکھرے ہوئے تھے۔ سنٹرل لائبریری بھوپال۔ کتب خانہ تاج المساجد۔ اسمٰعیل کتاب گھر۔ اور مدرسہ الٰہیہ کے کتب خانوں میں رفعت کے مخطوطات خود میری نظر سے گذرے ہیں۔

رفعت کا خاندانی کتب خانہ اپنے زمانے کی ایک عظیم لائبریری تھا جو ان کی وفات کے بعد اس طرح تباہ ہوا کہ غالب کے غیر مطبوعہ خطوط تک "اثاث البیت" میں شامل کر کے تقسیم کر لئے گئے۔ کچھ حیدر آباد دکن پہنچکر "گرمیٔ بازار" کی نذر ہوئے۔ کچھ بھوپال کے باذوق افراد تک جا پہنچے۔ غالب کا ایسا ہی ایک غیر مطبوعہ فارسی خط میرے دوست مولانا محمد ابراہیم خلیل مرحوم کے پاس تھا جس کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ یہ خط ان کے والد ماجد جناب مولوی محمد یوسف مرحوم کو لکھا گیا تھا۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی یہ خط یقیناً رفعت شروانی کے نام تھا۔

حیدر دہلوی

حیدؔر دہلوی

غالبؔ کے دہلوی شاگردوں میں میر مہدی مجروحؔ ۔ نواب مصطفےٰ خاں شیفتہؔ۔ ضیاء الدین نیرؔ۔ بہادر شاہ ظفرؔ۔ ہر گوپال تفتہؔ ۔ قربان علی سالکؔ ۔ سیف الحق ادیبؔ سجاد مرزا سجادؔ وغیرہ نے جتنی شہرت پائی آغا حیدر علی بیگ حیدؔر دہلوی کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا۔ حالانکہ تلامذۂ غالبؔ میں وہ اپنے بہت سے ساتھیوں کے مقابلے میں کچھ ایسی خصوصیات بھی رکھتے تھے جس سے انکے بہتیرے اُستاد بھائی محروم تھے۔ حیدؔر ایک پُرگو شاعر ہی نہیں تھے بلکہ ایک صاحب تصنیف نثر نگار بھی تھے جنکی نثری تصانیف اب بھی کہیں کہیں نظر آجاتی ہیں۔

حیدؔر کے حالات عام تذکروں میں نہیں ملتے مگر مختصر سا ذکر کہیں کہیں نظر آجاتا ہے۔ جناب مالک رام "تلامذۂ غالبؔ" میں تحریر فرماتے ہیں:-

"حیدؔر ـــــ آغا حیدر علی بیگ دہلوی ـــــ!

بزرگوں کا وطن مشہد تھا ان کے والد آغا بندہ علی بیگ تھے۔ حیدؔر نے بہت کم عمر میں شعر کہنا شروع کیا اس وقت عمر مشکل سے چودہ ۱۴ برس کی ہوگی۔ پیشے کے لحاظ سے اوورسیر تھے۔ جن ایام میں دریائے گنگا سے نہر نکل رہی تھی یہ مدتوں اٹاوہ (یو۔پی) میں مقیم رہے شعر کی تمام اصناف پر قادر تھے اس کے علاوہ نثر بھی لکھتے تھے۔ اُردو اور فارسی دونوں سے شوق تھا

تصانیف میں دیوان - نوحہ جات - مختار نامہ (اُردو)
مثنوی عزیز دل - فغان حیدر - رسالہ قافیہ (منظوم)
افیون نامہ (منظوم) کارزار نامہ (فارسی) یادگار چھوڑے"
(صفحہ ۹۷ تلامذۂ غالب)

جیسا کہ خود جناب مالک رام نے "حوالے" میں لکھا ہے یہ حالات تذکرہ "یادگار ضیغم" مؤلفہ نواب محمد عبداللہ خاں مرحوم (مطبوعہ مطبع قادری حیدر آباد دکن ۱۳۰۳ھ) سے ماخوذ ہیں اور "تلامذۂ غالب" میں حیدر دہلوی کی جس قلمی تصویر کا عکس شامل کیا گیا ہے وہ بھی اسی تذکرے کی ایک قلمی تصویر کا عکس ہے۔

صاحبِ "تذکرہ یادگار ضیغم" نے تحریر فرمایا ہے:-

"حیدر تخلص - حیدر علی بیگ نام - خلف آغا بندہ علی بیگ مرحوم مشہدی دہلوی ہیں - یہ مصنّف تصانیف کثیرہ ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ "بحر البکا دیوان نوحہ جات" مختار نامہ اُردو - مثنوی عزیز دل فغان حیدر - رسالۂ قافیہ منظوم - افیون نامہ منظوم کارزار نامہ فارسی وغیرہ انھیں کی تصانیف سے ہیں عمر چالیس برس کی ہے چودہ ۱۴ برس کی عمر سے شعر کہا ہے۔ اسد اللہ خاں غالب دہلوی سے انکو تلمذ رہا - فی الحال عہدۂ سب اور سیری پر منجانب سرکار انگریزی کے نہر گنگ اٹاوہ پر معمور ہیں آدمی ہوشیار ہیں سب قسم کی شاعری پر قادر ہیں یہ کلام ہے
(صفحہ ۱۱۶ - ۱۱۷ - تذکرہ یادگار ضیغم)

غالب کے دہلوی شاگردوں میں حیدر دہلوی سے زیادہ شائد ہی کوئی گمنام رہا ہو۔ کئی کتابوں کے مصنف اور مؤلف - پھر آغا شاعر دہلوی مرحوم کے حقیقی چچا ہونے کیوجہ

سے جو شہرت انھیں ملنی چاہئے تھی نہ ملی۔ شائد اس کا سبب یہی ہو کہ سرکاری ملازمت کی وجہ سے ان کی عمر کا بڑا حصہ دلی سے باہر گذرا۔ اور وہ اہلِ علم و ادب سے اتنا قریب نہ رہ سکے اور اپنے معاصرین میں نکھرنے اور ابھرنے کے مواقع انھیں حاصل نہیں ہو سکے۔

آغا حیدر بیگ کے مورثِ اعلیٰ آغا محمد مرتضیٰ ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ درانی کے ہمراہ اپنے بھائیوں کو لے کر مشہد مقدس سے ہندوستان چلے آئے تھے۔ نادری حملے کے بعد جب حالات پُرسکون ہوئے تو انھیں محمد شاہ کے دربار میں رسائی حاصل کرنیکا موقع مل گیا اور دربار سے منسلک ہو گئے۔

حیدر دہلوی کے دادا آغا رجب علی بیگ (۱۱۶۷ھ — ۱۲۴۴ھ) انھیں آغا محمد مرتضیٰ مشہدی کے پوتے تھے جن کے اعقاب کا نسب نامہ درج ذیل ہے:-

آغا رجب علی بیگ

آغا نجف علی بیگ
تھانیدار دہلی
(۱۷۷۴ء — ۱۸۵۲ء)

آغا بندہ علی بیگ
(۱۱۹۸ھ — ۱۱۹۶ھ)

کربلائی آغا عبد علی بیگ — آغا حیدر علی بیگ (حیدر دہلوی) — آغا میرزا علی بیگ — آغا اصغر علی بیگ — آغا ولائت علی بیگ

آغا ظفر علی بیگ
(آغا شاعر دہلوی)
ولادت ۱۲۹۰ھ — وفات ۱۹۴۰ء

آغا آفتاب دہلوی — آغا سرخوش — آغا اقبال — سما قزلباش

حیدر دہلوی کے والد ماجد آغا بندہ علی بیگ کا شمار عمائدینِ دہلی میں تھا مغل

دربار میں بھی رسائی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی سے تو ان کا تعلق اپنے باپ کے زمانے سے قائم ہو چکا تھا۔ برادرم آغا آفتاب دہلوی کے پاس جو قلمی نسب نامہ خاندانی محفوظ ہے اس میں ان کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے :۔

"آغا بندہ علی بیگ بن آغا رجب علی بیگ سرکارِ ہند میں ملازم ہوئے اور فوج کے بڑے عہدیدار تھے مگر وہاں سے استعفیٰ دے کر اپنے بھائی آغا احمد علی کو لیکر دلّی میں مقیم ہو کر خانہ نشین ہو گئے ۔ رسالہ ۱۸ بنگالہ جو کرنل رینی (COL RANY) کی قیادت میں تھا کرنل صاحب نے انھیں لاہور بلوا لیا اور اپنے رسالے میں انھیں "پے دفعدار" (PAY DAFADAR) بنا دیا جہاں سے وہ پنشن لے کر دلّی واپس آگئے۔ ۱۸۷۸ء میں دلّی ہی میں انتقال ہو گیا۔"

ایسٹ انڈیا کمپنی کے اس تعلق و توسل کی وجہ سے غدر بعد آغا بندہ علی بیگ کے کئی صاحبزادے محکمۂ نہر میں ملازم ہو گئے حیدر بھی انھیں میں سے ایک تھے ۔ دہلی اور نواح دہلی میں آبپاشی کیلئے ایک پورا منصوبہ تیار کیا گیا تھا جسکے تحت جمنا اور گنگا سے کئی نہریں نکالی گئیں۔ جگہ جگہ بند بنائے گئے اور یہ تمام کام انگریز انجینیروں کی نگرانی میں انجام دیا گیا۔ جامعہ نگر (اوکھلا دہلی) میں جمنا سے جو نہر نکالی گئی اسکا کام بھی ایک انگریز انجینیر کاٹلی صاحب (KATLY) کے سپرد تھا جن کے متعلق اکبرؔ الہ آبادی کے اس غیر تاریخی مصرعے نے تاریخی اہمیت حاصل کر لی ۔

"کاٹلی صاحب" نے جمنا کاٹ لی

حیدر بھی اپنے قدیم توسل سے محکمۂ نہر میں اورسیری کے عہدہ پر مامور ہوئے اور یو۔ پی کے مختلف اضلاع میں عرصے تک گھومتے رہے ۔ اٹاوہ میں زیادہ قیام رہا پنشن لینے کے بعد دلی واپس آگئے اور اس صدی کی دوسری دہائی میں یہیں وفات پائی

مدفن " شاہِ مردان " (متصل صفدر جنگ نئی دہلی) میں ہے لیکن کس مقام پر؟ شاید یہ بتانے والا اس دنیا میں اب کوئی نہیں ہے ۔

حیدر کے تفصیلی حالات پر گمنامی کے گہرے پردے پڑے ہوئے ہیں ان کے اعقاب و متعلقین میں انکے حقیقی بھتیجے آغا شاعر دہلوی مرحوم کے صاحبزادوں (آغا آفتاب دہلوی ۔ آغا سرخوش دہلوی ۔ اور آغا اقبال دہلوی) کے سوا اب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے ۔

خاندانی روایات سے اندازہ ہوتا ہے کہ حیدر ایک خاموش فطرت اور قدیم وضع کے سیدھے انسان تھے ۔ ذاتی شہرت اور پروپیگنڈے سے انھیں دور کا واسطہ نہیں تھا ۔ مشاعروں میں کم شریک ہوتے تھے اسی لئے ان کا کلام اس دَور کے گلدستوں میں بہت تلاش کے باوجود دستیاب نہیں ہو سکا ۔ قدیم تذکروں میں کہیں کہیں کچھ ذکر ملتا بھی ہے تو برائے نام ۔ مثلاً " تلامذۂ غالب " کے ایک نو دریافت تذکرہ " تذکرہ بشیر[۵]" میں حیدر دہلوی کا ذکر بالکل سرسری طور پر کیا گیا ہے ۔

۵؎ سہ ماہی " اُردو " کراچی (شمارہ خصوصی بیادِ غالب) بابتہ جنوری ۔ فروری ۔ مارچ ۱۹۶۹ء جلد ۴۵ ۔ شمارہ ۱ میں غالب اور تلامذۂ غالب تذکرہ بشیر میں " کے عنوان سے ایک قلمی تذکرے کی نشاندہی کی گئی ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ تذکرہ شاہ نصیر دہلوی کے چھوٹے بیٹے شاہ نجم الدین صغیر کے حقیقی نواسے شاہ بہاؤالدین دہلوی المعروف بہ عبداللہ شاہ بشیر نے نساخ کے تذکرہ " سخنِ شعر " پر بطور حواشی تحریر کیا ہے اور سترہ ۱۷ ایسے شاعروں کا اضافہ کیا ہے جنکا ذکر نساخ نے نہیں کیا ہے انھیں حواشی سے تلخیص کر کے اس مضمون میں ایک ایک تذکرہ ترتیب دے کر اس کا نام " تذکرۂ بشیر " رکھ دیا گیا ہے ۔ حالانکہ اس مضمون میں تسلیم کیا گیا ہے کہ عبداللہ شاہ بشیر کی تالیفات میں (۱) تذکرۂ نگارستانِ بشیر ۔ (۲) بہارستان اشعار ۔ (۳) تذکرہ فیضان نصیر (۴) اور کشکول بشیر کے سوا کسی اور تذکرے کا پتہ نہیں چلتا ۔

نادم سیتاپوری

"حیدر" ــــ مرزا حیدر علی بیگ!

حیدر۔ تخلص۔ مرزا حیدر علی بیگ دہلوی ....
واسوخت مسمیٰ بہ "فغان حیدر" نظر سے گذرا ہے۔

کفر و بدعت (سے) نہ اسلام سے ہے کام مجھے
دہرِ فانی میں نہیں چاہیئے کچھ نام مجھے

(سہ ماہی اُردو کراچی صفحہ ۲۳۶)

دلّی کا یہ ممتاز گھرانا "صاحب سیف" بھی تھا اور "صاحب قلم" بھی۔ لیکن انقلابات زمانہ نے "سیف" سے تو محروم کیا ہی تھا "معاشی تگ و دو" نے رفتہ رفتہ "قلم" سے بھی محروم کر دیا۔

اس سو سال کے اندر حیدر کے بعد اس خاندان میں آغا شاعر قزلباش دہلوی جیسی نامور شخصیت کے سوا کوئی دوسری ہستی نظر نہیں آتی۔ آغا شاعر دہلوی حیدر کے حقیقی بھتیجے اور مرزا داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ نثر و نظم دونوں پر اتنی قدرت حاصل تھی کہ بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے کہ آغا شاعر مرحوم ادیب اچھّے تھے یا شاعر ـــ!

حیدر دہلوی غالبؔ کے شاگرد تھے اور آغا شاعر ذوقؔ کے سلسلے سے تعلّق رکھتے تھے۔ مگر جہاں تک غالبؔ کے کمالِ فن کا تعلّق ہے آغا شاعر کی ناقدانہ نگاہ پورے ادب و احترام کے ساتھ غالب کے سامنے سر بسجود نظر آتی ہے ــــ عربک کالج دلّی کے "یومِ غالبؔ" میں آغا شاعر مرحوم نے غالبؔ کی بارگاہِ فن میں جو "نذرانہ عقیدت" پیش کیا تھا وہ آغا صاحب مرحوم کی وہ غیر مطبوعہ نظم ہے جو اب تک کہیں شائع نہیں ہوئی۔ آغا آفتاب دہلوی (خلف آغا شاعر مرحوم) کے شکریے کے ساتھ یہ نظم پہلی بار شائع کی جا رہی ہے ـــ یہ نظم "یومِ غالبؔ" میں خود آغا صاحب مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں پڑھی تھی جس کے ایک ایک لفظ سے ان کا مخصوص رنگ و آہنگ نمایاں ہے۔

اطلس کا لبادہ اوڑھے تو۔ افلاک پہ ہے پَر مار رہا
پڑتے ہی شعاعیں سورج کی ہر نقش ترا زرکار رہا
غالبؔ بھی۔ اسدؔ بھی دونوں ہیں قوت کے ترے یہ دو دھوے
ہر شعر ترا اک صنعت ہے۔ آسان کبھی۔ دشوار رہا
تو اپنے زمانے والوں میں اعجاز کے جلوے لے نکلا
وہ سحر میں اپنے مست رہے۔ تو مستی میں ہُشیار رہا
شیراز کی مے جب تلخ ہوئی۔ اے گنگ وجمن کے متوالے
دونوں کو ملا کر رنگ دیا۔ ہر رنگ جواہر کار رہا
عرفیؔ کی تڑپ سے آگے تھا۔ تو نے ہی نظیریؔ کو روندا
تو فخرِ غنی و طالبؔ تھا۔ ہر صنف میں آتش بار رہا
نقاشِ نقوشِ قدرت تھا۔ تو نبض شناسِ حکمت تھا
تو آئینہ دارِ طلعت تھا۔ جو طوطئ شکّر بار رہا
ہر شعر کی شہرت بعد ترے اُمّید سے بڑھ کر ہو کے رہی
ہنگامۂ عالم دیکھ ذرا۔ تو خواب میں بھی بیدار رہا
سچ ہے کہ فلک افلاک کجا۔ یہ ذرّۂ بے مقدار کجا
شاؔعر سے تجھے کیا نسبت ہے تو گل ٹھہرا وہ خار رہا

قدیم دلّی اب سے نصف صدی اُدھر گئے "شعری سجّادوں" میں بٹی ہوئی تھی پھر بھی غالبؔ کے فن و فکر کے قدر دانوں سے خالی نہیں تھی۔ غالبؔ سے حیدرؔ کے سلسلۂ تلمذ کی تفصیلات نہیں ملتیں لیکن یہ ایک حقیقت تھی کہ اس خاندان سے بھی غالبؔ کا ربط ضبط تھا کیونکہ یہ خاندان دلّی کے ان چند گنے چنے میں ایک تھا جو اس جو اس زمانے میں ممتاز سمجھے جاتے تھے۔

حیدرؔ دہلوی کی جن تصانیف کا ذکر "صاحب تذکرہ یادگارِ ضیغم" نے کیا ہے جناب مالک رام بھی اسی منزل پر آکر ٹھہر گئے۔ یہ صحیح ہے کہ حیدرؔ کی یہ مطبوعات بھی

اب کمیاب سے کمیاب تر ہوتی چلی جارہی ہیں کہیں ایک آدھ کتاب نظر آجاتی ہے اور ان کا قلمی دیوان تو شاید اب کہیں بھی دستیاب نہ ہوسکے کیونکہ ۱۹۴۸ء میں دلّی پر جو تباہی آئی اس نے دنیائے علم و ادب کو ہزاروں گرانمایہ مخطوطات سے محروم کردیا۔

حیدر کی غیر مطبوعہ تصانیف کے علاوہ ایک مطبوعہ کتاب "دِل کُم" کا اور پتہ چل سکا ہے جس کا صرف ایک بوسیدہ نسخہ برادرم سرخوش دہلوی (ابن آغا شاعر دہلوی) کے ذاتی ذخیرے میں محفوظ ہے۔ "دِل کُم" نظم و نثر پر مشتمل ایک ایسا ہی مختصر سا رسالہ ہے جس قسم کی بہت سی "خیر مقدمی" کتابیں ۱۹۱۱ء میں ایڈورڈ ہفتم کی آمد پر اُردو اور انگریزی میں شائع ہوئی تھیں۔ ایڈورڈ ہفتم کی آمد پر "دلّی دربار" کے نام سے ایک تاریخی جشن بھی منایا گیا تھا جس میں ہندوستان بھر کے راجہ۔ مہاراجہ اور نوابین نے شرکت کی تھی۔ اکبر الٰہ آبادی کی وہ مشہور نظم (جسکے دو شعر یہ ہیں)^ہ

سب سے اونچے لاٹ کو دیکھا
جمنا جی کے پاٹ کو دیکھا
سڑک پہ سرخی کٹتے دیکھی،
آتش بازی چھٹتے دیکھی،

اسی "دلّی دربار" کا ایک خاکہ ہے۔

"دِل کُم" ۱۹۱۱ء میں مطبع قیومی کان پور میں چھپی تھی جس میں نظم و نثر میں ایڈورڈ ہفتم کی آمد پر روائتی انداز کا "خیر مقدم" کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ نیم سیاسی قسم کی نظمیں بھی ہیں جن کا تعلق سرسید تحریک یا مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کے قیام سے ہے۔

مسلم یونیورسٹی کے قائم کرنے والوں میں سر آغا خاں کا نام رہتی دنیا تک رہیگا۔ حیدر دہلوی نے اس نظم میں سر آغا خاں مرحوم کو شاندار الفاظ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے جو "ویلکم" میں شامل ہے۔

ہ

سیدؔ[1] نے جو کہا وہی آغا[2] نے کر دیا
سیدؔ نے سر دیا مگر آغا نے زر دیا
ہم تیرہ بخت شامِ غریباں سے تھے نڈھال
آغا نے بخشنے میں ہمیں نورِ سحر دیا
چندہ ہو دو کروڑ کا تیری ہے یہ دُعا
آغا نے بیس لاکھ ہی ابتک نذر دیا[3]
بے خانہ بے دیار تھی یہ قوم جانگداز
اب قیصری صلاح سے آغا نے گھر دیا

غزل میں حیدرؔ دہلوی کا کیا مقام تھا۔؟ اس کے بارے میں کچھ کہنا دشوار ہے کیونکہ سوائے ان چند اشعار کے جو جناب مالک رام نے "تذکرہ یادگار ضیغم" سے اپنے تذکرہ "تلامذۂ غالب" میں نقل کر دیے ہیں ان کا کلام دستیاب نہیں ہو سکا۔ اور جہانتک نظم کا تعلق ہے میں سمجھتا ہوں انھیں نظم پر قدرت حاصل نہیں تھی۔ "یادگار ضیغم" اور تلامذۂ غالب میں حیدرؔ کی غزلوں کا جو سرسری انتخاب شامل کیا گیا ہے وہ بھی ان کی ابتدائے مشق سخن سے تعلق رکھتا ہے۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ان کا شعری فن نعت۔ منقبت۔ سلام اور نوحے تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ "دیوان نوحہ جاتِ حیدر" (معہ مناجات) جلد اوّل کا دوسرا ایڈیشن آغا سرخوش دہلوی کے پاس محفوظ ہے۔ یہ مجموعہ ۱۸۹۰ء میں نولکشور پریس لکھنؤ میں چھپا تھا۔ غالباً دوسری جلد چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ اسں مجموعہ میں قدسیؔ کی شہرہ آفاق نعت پر حیدرؔ کی ایک تضمین بھی شامل ہے جس میں حیدرؔ نے قدسیؔ کے مطلع پر مختلف زاویوں سے مصرعے

---

[1] سر سید احمد خاں
[2] سر آغا خاں [3] یہ مصرعہ غلط چھپ گیا ہے۔

لگائے ہیں۔ چند بند ملاحظہ ہوں۔

اہلِ دنیا کی جو آنکھوں پہ قدم تمنے رکھا
آنکھوں نے اپنا شرف جان کے سائے کو لیا
اس لئے سایہ نہیں اس قدِ رعنا میں ہوا
دیکھ اعجاز ترا چشم نے ہر دل کی کہا
مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل وجاں بعدِ فدایت چہ عجب خوش لقبی

ایک انگشت سے شق تم نے کیا جبکہ قمر
تیرے فرماں کے ہوئے تابع وہیں اہلِ خبر
شق ہوا چاند شہا جو نہی پڑی تیری نظر
کہتا تھا ہا کھٹ۔ مبارک ہو شہِ جن و بشر
مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل وجاں بعدِ فدایت چہ عجب خوش لقبی

پردۂ غیب میں اللہ تھا یا دستِ خدا
ہے یقین مجھ کو "یداللہ" نہ بولا ہوگا
پاسِ آداب سے لب اس کے ہوئے ہونگے نہ وا
اس لئے میں یہی کہتا ہوں کہ خالق نے کہا
مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی
دل وجاں بعدِ فدایت چہ عجب خوش لقبی

شافعِ روزِ جزا تم ہو شہِ جن و بشر
تم کو لولاک کہا خالقِ اکبر نے مگر
لطف کر حیدرِ ناچیز پہ بہر حیدر رض
وِرد اس کے یہی کلمہ ہے شہا آٹھ پہر

مرحبا سیّدِ مکّی مدنی العربی

دل وجاں بعدِ فدایت چہ عجب خوش لقبی

حیدر دہلوی کے یہ مختصر حالات سلسلۂ تلامذہ غالبؔ کی ایک کڑی کا درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں غالبؔ کے فن کا پرتو تلاش کرنے کے لئے ہمیں انکی غزلیہ شاعری کا جائزہ لینا ہوگا۔ جس کے نقوش کا مدّھم عکس بھی اب کہیں نظر نہیں آتا۔!
